سلسلہ پھولوں کا



بساطِ گل ہو یا دامانِ صحرا
جنوں کا قافلہ چلتا رہے گا

صلاح الدین نیّر

تاریخ وسنِ اشاعت : یکم جنوری ۱۹۹۲ء
تعدادِ اشاعت پہلی بار : ایک ہزار
کتابت : مسعود انور
طباعت : اعجاز پرنٹنگ پریس۔ چھتہ بازار، حیدرآباد
طباعت سرِورق : انتخاب پریس، جواہر لال نہرو روڈ۔ حیدرآباد
ناشر : صلاح الدین نیّر
ترتیب و تزئین : ▪ ڈاکٹر صابرہ سعید (رخسانہ)
▪ انیس قیوم فیاض

▪ جزوی رقمی اعانت : اُردو اکیڈیمی، آندھرا پردیش
▪ قیمت ▪ عام خریداروں کے لئے :- ۳۰/- روپے
بُک سیلرز اور لائبریریوں کے لئے :- ۵۰/- روپے

-: ملنے کے پتے :-
○ حسامی بُک ڈپو ۔ مچھلی کمان ۔ حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۰۲
○ مصنف ۔ 'کہکشاں' ۱۱-۳-۸۲۴/۷ ملے پلی، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱
فون نمبر : ۲۲۸۸۰۲



صلاح الدين نير

اِنتساب

محترم المقام

جناب عابد علی خاں

اور

جناب محبوب حسین جگر

کے نام

جن کی بے پایاں شفقت، مخلصانہ تربیت
اور دیرینہ سرپرستی میں میرا ذہنی سفر جاری ہے
خوشبو کے سفر کی طرح

صلاح الدین نیّر

ترتیب و تزئین

صفحہ نمبر

کارزارِ حیات (ملازمت، اعلیٰ عہدیداروں سے مراسم، ادبی و فلاحی مصروفیات)

علمی، ادبی و تہذیبی سرگرمیاں

خوشبو کا سفر

رشتوں کی مہک (منہ بولی بہنیں)

سرگذشتِ دل

ایک دن مجھے صدر شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی پروفیسر عبدالرزاق فاروقی کی ایک سفارشی تحریر ملی، جس کے ذریعہ مجھے اس بات کی اطلاع دی گئی کہ گلبرگہ یونیورسٹی نے شعبۂ اردو گلبرگہ کے ایک طالب علم منظور خواجہ معین الدین کو میری (صلاح الدین نیر کی) شاعرانہ زندگی پر مقالہ لکھنے کی اجازت دی ہے۔ اس سلسلے میں مجھ سے فاروقی صاحب نے خواہش کی کہ میں اس طالب علم سے مقالہ کی تکمیل کے سلسلہ میں ہر ممکنہ تعاون کروں۔

گلبرگہ یونیورسٹی کے اس فیصلے کے بعد میں نے اپنی ۳۰ سالہ شاعرانہ زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی حیات کے اُن اوراق کو بھی اُلٹنا شروع کیا جو میری نشوونما، ارتقاء اور ذہنی تربیت میں کلیدی رول ادا کرچکے ہیں۔ میں نے اپنی بکھری ہوئی حیات کے ایک ایک لمحہ کو سمیٹ کر اُس طالب علم کے حوالے کیا۔ کچھ دنوں تک اس طالب علم کا مجھ سے ربط رہا اور وہ سب کچھ سوالنامے سے دستاویزی شکل میں ... حاصل ہوا جو ایک مقالہ کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مختلف نوعیت کے سوالات اور شخصی انٹرویوز میں بعض ایسے واقعات و واردات بھی ضبطِ تحریر میں لائے گئے جن کو میں تقریباً بھول چکا تھا۔

مقالہ کی صورت گری، تدوین و ترتیب اور میری زندگی کے خدوخال سے تجزیہ

کے دوران میرے دل میں دفعتاً یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ اپنی خودنوشت لکھی جائے ۔ یوں بھی میں نے سوچ رکھا تھا کہ اپنی غزلوں (سفر جاری ہے) اور نظموں (یہ کیسا رشتہ ہے) کے مکمل انتخاب کی اشاعت کے بعد فرصت کے لمحوں میں خود نوشت لکھوں ــــــ میں اس کام کا آغاز کرنا ہی چاہ رہا تھا کہ اچانک سارے شہر میں انسانیت کی بنیاد ہلا دینے والا اپنی نوعیت کا منصوبہ بند فساد پھوٹ پڑا۔ سینکڑوں معصوم و بے گناہ (مرد و خواتین، بچے، جوان، بوڑھے) موت کی آغوش میں چلے گئے اور ہزاروں خاندان بے گھر ہو گئے۔ مسلسل کئی دن تک کرفیو رہا۔ شہر کے لوگ اُن دنوں بلا تخصیصِ مذہب و ذات، فرقہ، خوف و ہراس کے عالم میں اپنے تحفظ کے لئے رات رات بھر جاگتے رہے۔ میرے محلے ملے جلی میں اگرچہ کوئی قابلِ ذکر حادثہ پیش نہیں آیا لیکن ناگہانی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں اپنی اپنی حفاظت کے لئے تیار رہے۔ کرفیو کے زمانے میں فرصت ہی فرصت تھی۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ ٹی۔ وی اور ریڈیو سے خبریں سُننے کے علاوہ اپنی پسند کی کتابیں پڑھنا ہی وقت گذارنے کا ایک مشغلہ رہ گیا تھا۔ متفرق ادبی کاموں کی یکسوئی کے بعد جب مجھے اپنی ادبی زندگی میں پہلی دفعہ فرصت کا احساس ہوا تو مجھے اپنی خود نوشت لکھنے کا خیال آیا اور میں نے دس، بارہ دن میں زائد از ایک سو صفحات لکھ ڈالے ۔ کچھ دنوں کے بعد ان میں کچھ اور صفحات کا اضافہ ہوا، پھر نظرِ ثانی کے بعد کتاب کی ضخامت کچھ اور بڑھ گئی ــــــ میرے محلے میں ابتدا ہی سے امن کی فضاء برقرار رہی ۔ محلے کے لوگ نسبتاً سکون و

اطمینان سے رہے۔ راتوں کو محلے کے سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر رات گذارتے رہتے لیکن میں اپنے ڈرائینگ روم میں رات کے ایک ڈیڑھ بجے تک لکھتا رہتا تھا' ایسا نہیں تھا کہ میں حالات سے بے خبر تھا۔ جب کبھی دور سے ہوائی فائرنگ کی آواز سنائی دیتی تو میں بھی چند منٹ کے لئے چھت پر چلا جاتا اور صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد اپنے روم میں واپس آجاتا تھا۔

میں نے اس کتاب میں حتی الامکان اپنی زندگی کے مختلف گوشوں اور اپنے روز و شب کی سرگرمیوں کو محفوظ کیا ہے۔ اس کے باوجود مجھے احساس ہے کہ بہت کچھ واقعات و واردات شامل ہونے سے رہ گئے ہیں' جن کو ضبطِ تحریر میں لایا نہ جاسکا۔ میری زندگی کے مختلف النوع گوشوں اور پہلوؤں کو سمجھنے' میری حیات اور شاعری کا جائزہ لینے کے لئے ان اوراقِ زندگی سے بھی مدد مل سکے گی۔ میں نے حتی المقدور زندگی کی مثبت قدروں' قلندرانہ طبیعت' خودداری' رشتوں کی پاسداری' بے لوث محبت کے تقاضوں اور خلوص و مہر کے تحفظ و بقاء کی کوشش کی ہے۔

حیدرآباد کی میری زندگی رشتوں کی دھوپ چھاؤں میں گذری ہے۔ کچھ رشتے تو میری زندگی کے لئے جزوِکل کی حیثیت رکھتے ہیں تو کچھ رشتے معطر فضاؤں کی طرح دل وجان کا حصہ بن چکے ہیں اور کچھ رشتے اپنی شناخت اور پہچان کے لئے معاشرہ کی ریشمی ڈوری میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان تمام بنتے' سنورتے' ٹوٹتے اور بکھرتے رشتوں کے باوجود رشتوں کی مہک' روابط کی پاکیزگی' جذبات کی شائستگی' تقدس' اور روابطِ قلبی کی ماہیت میں کچھ فرق

نہیں آیا۔ زندگی کے بعض ایسے روشن پہلو بھی ہوتے ہیں جن کی بدعاثیت اور تشنا ندہی سے بھی انسانی رشتے لازوال ہو جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض رشتے اپنی شناخت کے لئے اپنے ہی ماحول میں برسوں اپنی تلاش جاری رکھتے ہیں۔

حساس طبع لوگ جب بھی زندگی کے نازک لمحات کو پیراہنِ گُل سے نوازتے ہیں تو ماحول کی کشمکش اور معاشرے کی نرمی و گرمی سے بھی گذرتے رہتے ہیں۔ ایسے حالات سے جب انسان رفتہ رفتہ مانوس ہوجاتا ہے تو اُس کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ انسان اپنی شناخت کے لئے دوسروں کی پہچان کا بھی سہارا لیتا ہے۔ ایسی کیفیات ان ہی لمحات کی دین ہوتی ہیں جو ایک حساس انسان کے حصے میں آتی ہیں۔ ان تمام کیفیات کی ایک شکل بھی ہوتی ہے۔ کبھی تو یہ شکل رحمت نوازلمحوں کی صورت میں نقشِ اوّل بن کر اُبھرتی ہے تو کبھی اُم ہانی طرزِ حیات کی طرح نقشِ ثانی بن کر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس پس منظر میں کہیں طلعتِ جسم و جاں اختر شناسی کرنے لگتی ہے تو کہیں عشرتِ زندگی فرزانگی کا تسلسل نظر آتی ہے۔ نقشِ اول جہاں طلعت و نسرین کے اُجالوں اور خوشبو سے تن من کو مہکاتی رہتی ہے تو وہیں نقشِ ثانی عشرتِ فرزانگی سے مشامِ دل کو معطر کر دیتا ہے، زندگی ان ہی نقوش کی چھاؤں میں گذر رہی ہے۔ مجھے جتنا تعلق "گُلِ تازہ" سے ہے اتنا ہی "زخموں کے گلاب" سے بھی ہے۔ یہ دونوں میری حیات اور شاعرانہ زندگی سے وابستہ ہیں۔ یہی سلسلہ جب طویل ہوجاتا ہے تو صنم تراش، شکن در شکن، رشتوں

کی مہک، خوشبو کا سفر، سفر جاری ہے اور یہ کیسا رشتہ ہے، تک پہونچ جاتا ہے۔

میں نے اس کتاب کو ۵ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

سرچشمۂ فیضان (اسلاف کی خوشبو)

گھر آنگن

میں نے اس باب میں قصبہ ہمناباد، ضلع بیدر کے قیام و وجود کے پس منظر میں اپنے اسلاف کی ہمناباد میں آمد، خاندانی تسلسل، بچپن، کھیل کود، شرارتوں، محبتوں اور اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت کی تفصیل پیش کی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے ایسے واقعات بھی قلمبند کئے ہیں جن کے مطالعہ سے میری ذہنی، مذہبی، تہذیبی زندگی اور میرے سیکولر مزاج ہونے کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ کتاب میری حیات کے مختلف پہلوؤں اور زاویوں کو سمجھنے کے لئے ایک دستاویزی شکل کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے کتاب کے ہر حصہ میں طوالت کے خیال سے اگرچہ مکمل تفصیلات سے گریز کیا ہے لیکن کوشش کی ہے کہ مختصراً ہی سہی، اپنی بات قارئین تک صحیح شکل میں پہونچ جائے۔ ہمناباد میں اپنے قیام کے زمانے کے بعض یاد رکھے جانے والے واقعات و واردات کے علاوہ اس کتاب میں میری حیدرآباد میں آمد، پولیس ایکشن، علیگڈھ کا سفر اور دیگر واداتی و تہذیبی واقعات بھی ملیں گے۔ میں نے کتاب کی ابتدائی سطور میں اپنے

خاندان کے بہت سے افراد کو ایک شجرہ کی شکل میں محفوظ کیا ہے تاکہ بعد میں آنے والی نسلوں کو اپنے بزرگوں اور افرادِ خاندان کے بارے میں زیادہ نہ سہی کچھ تو واقفیت ہو۔

کارزارِ حیات :

(ملازمت ۔ اعلیٰ عہدیداروں سے مراسم ۔ ادبی و فلاحی سرگرمیاں)

اس حصۂ کتاب میں اپنی ملازمت کی نرمی و گرمی کی تفصیلات، سکریٹریٹ کے اوسط و اعلیٰ عہدہ داروں، دوستوں اور ساتھیوں سے روابط اور ان کا مختلف کاموں میں مجھ سے تعاون اور میری شاعرانہ زندگی اور شعر و ادب سے دلچسپی۔ سکریٹریٹ اسوسی ایشن کی سرگرمیوں کی وجہ سے اعلیٰ عہدہ داروں سے میرے دوستانہ و روادارانہ مراسم اور کس کس عہدہ دار نے میری سفارش پر کن کن ضرورت مندوں کی مدد کی ، قلم بند کیا ہے۔
سکریٹریٹ کی زائد از ۳۰ سالہ مدتِ ملازمت میں بے شمار ایسے واقعات بھی رونما ہوئے ہیں جن میں میری شخصی زندگی کا بے لوث دخل رہا ہے۔ میں نے جہاں کہیں ضرورت محسوس کی ان واقعات کو حوالوں کے ساتھ بیان کیا ہے اور عہدہ داروں کی اُن مہربانیوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے بے شمار لوگوں کی زندگی میں بہار آئی۔ ان عہدہ داروں کی عنایتوں کا تذکرہ کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ میں یہ شکلِ تحریر ان کی عظمت کا احترام کروں، جن کی انسانیت نوازی کی وجہ سے بے شمار مستحق اہلِ غرض اصحاب

سے تعاون ممکن ہو سکا۔ اور جہاں تک میرے تعاون کی بات ہے، میں نے واضح طور پر کہا ہے کہ سکریٹریٹ کی ملازمت کے دوران میرا رویہ بعد سلوک اپنے دوستوں اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے بارے میں کس طرح کا رہا ہے۔

علمی، ادبی و تہذیبی سرگرمیاں

کتاب کے اس گوشے میں میرے حیدرآباد آنے کے بعد سے آج تک جن علمی، ادبی و تہذیبی انجمنوں اور اداروں سے میری وابستگی رہی ہے، ان کا اجمالاً ذکر ہے۔ ان اداروں سے وابستگی اور سرگرمیوں کے اظہار کا مقصد یہ بھی ہے کہ یہ بتاؤں کہ یہ بندہ ہیچ کن کن حالات، مقامات اور منزلوں سے گذرتا رہا ہوں۔

خوشبو کا سفر

مجھے یاد ہے کہ جب میرا پہلا مجموعۂ کلام "گلِ تازہ" شائع ہوا تو میں نے فرطِ مسرت سے کتاب کی پہلی جلد اپنی والدۂ محترمہ کی گود میں رکھ دی تھی۔ میری والدہ نے خوش ہو کر مجھے دعائیں دی تھیں۔ شائد ماں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ میں نے رشتوں کی مہک کو محسوس کرتے ہوئے خوشبو کا سفر جاری رکھا۔ یہ گوشہ میری شاعرانہ زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس حصہ کے

مطالعہ سے قارئین کو میری شاعری کے خط و خال کا صحیح اندازہ ہوگا۔

رشتوں کی مہک (منہ بولی بہنیں):

مجھے اپنی حقیقی بہنوں سے جتنی محبت ہے، اتنی ہی محبت اپنی منہ بولی بہنوں سے بھی ہے۔ حقیقی بہنوں کی معصوم و خاموش محبت جہاں گاؤں کی پُرکیف فضاؤں میں رس گھولتی رہی وہیں منہ بولی بہنوں کی بےلوث محبت، شہر کی پُررونق، نکھری ستھری، پاکیزہ، کیف آور، شائستہ شگفتہ، دل و جان کو معطر کرنے والی محفلوں اور مہذب ماحول کے لئے سرمایۂ حیات ہے۔ ان کی محبت میں سادگی، والہانہ پن ہے تو ان کی محبت میں سپردگی اور بےساختگی ہے۔ اس والہانہ پن اور اس بےساختگی کے نازک، لطیف اور پُراثر کیفیات سے اکثر گذرتا رہتا ہوں۔

گاؤں کی بھینی بھینی فضاؤں میں جن بہنوں کے پیار نے میری زندگی کے ابتدائی زمانے میں میرے کردار اور میری شخصیت کو بنانے میں اہم حصہ ادا کیا ہے اسی طرح جب میں شہر آیا تو شہر کے ماحول میں میری منہ بولی بہنوں نے زندگی کی رعنائی، فطرت کی خوبصورتی، ماحول کی تر و تازگی اور معاشرہ میں پھیلی ہوئی خوشبو کا احساس دلایا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بےغرض اور بےلوث پاکیزہ رشتے ان عظمتوں اور شرافتوں کو بھی زبان دیتے ہیں جو سناٹے کو آواز میں بدل دیتے ہیں۔ بےلوث پاکیزہ رشتوں کا یہ

کا دستہ میرے خانۂ دل کو تابہ حیات مہکاتا رہے گا۔

کتاب کا یہ آخری حصہ لطیف و نازک جذبوں، پاکیزہ و مقدس رشتوں، دل و دماغ میں گھر کرنے والی یادداشتوں اور فکر و خیال کی خوشبوؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس حصہ میں، میں نے رشتوں کی صداقت و تازگی، پاکیزگی و شگفتگی کی ایسی واضح اور شاعرانہ تصویر کھینچی ہے کہ رشتوں کے احترام میں اضافہ ہوا ہے۔

بھائیوں نے اپنی منہ بولی بہنوں کی بے لوث چاہت، محبت، غمگساری اور پاسداری میں اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ گزارا ہے، وہیں ان کی زندگی کو خوشگوار بنانے اور ان کے بہترین مستقبل کے لئے بھی پُر خلوص کوشش کی ہے۔ دیانتداری کے ساتھ بعض بہنوں کے اُن احسانات کا بھی ذکر کیا ہے جن کی عطا و کرم نے بھائی کی زندگی کا رُخ ہی بدل دیا ہے۔ میں نے برسوں پرانے رشتوں کو جو حرف وارداتِ قلبی کے ترجمان بنے ہوئے تھے ضبطِ تحریر میں لاکر اُن کی معصوم اور مروتوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

یکم جنوری ۱۹۹۰ء

صلاح الدین نیّر



سرچشمۂ فیضان (اسلاف کی خوشبو)

گھر آنگن

مجھے اپنے وطن ہمناباد کے بسائے جانے کی تاریخ، تلاشِ بسیار کے بعد بھی نہ تو بہ شکلِ مخطوطہ ملی اور نہ ہی بہ شکلِ کتاب، البتہ ہمناباد کے ایک معمر بزرگ بسونپا اگرکی نے جو (۹۰) برس کے ہوں گے، ایک ملاقات میں کہا کہ راجہ رام راچندر نے ۱۱۲۸ء میں ہمناباد کے نام سے ایک شہر بسایا تھا۔ ہمناباد کے آباد ہونے کے بارے میں، میں نے اپنے دو پھوپی زاد بھائی الحاج محمد عبدالشکور اور الحاج محمد غوث محی الدین صاحب کے علاوہ اپنے بچپن کے دوست اور اسکول کے ساتھی مشہور و معروف ایڈوکیٹ مسٹر ویر بھدریا سے بھی معلومات حاصل کیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہمناباد کا نام پہلے جے سنگھ نگر تھا، بعد میں نظام کے دورِ حکومت میں ہمایوں نامی کسی شخص کے نام کی مناسبت سے ہمناباد کے نام سے مشہور ہوا۔ ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ ہمناباد کا نام ہنود آباد تھا جو بعد میں ہمناباد کے نام سے شہرت پاگیا۔ ہمناباد میں لنگایت طبقہ کے ہندو رہتے تھے۔

ہمناباد کا قلعہ، فصیل اور مشہور دیول ویر بھدر ایشور ایک ساتھ تعمیر ہوئے تھے۔ ہمناباد کی فصیل کے چھ دروازے تھے۔ ہمناباد کی آبادی پہلے فصیل کے اندر تھی، سارا ہمناباد فصیل سے گھرا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ فصیل کے باہر بھی لوگ بسنے لگے جو

بعد میں کئی محلوں میں تقسیم ہو گئے۔ فصیل کے دروازوں پر سخت پہرہ رہتا تھا۔
ہر کمان پر ایک توپ نصب تھی۔ ایک بڑی توپ نظام کے دورِ حکومت میں بیدر
کو منتقل کی گئی۔ پہلے راجہ کا پایہ تخت بھالکی تھا۔

جب راجہ کو ایک شہر بسانے کا خیال آیا تو روایت ہے کہ راجہ سے کسی
سنت، سادھو یا کسی صوفی بزرگ نے یہ کہا کہ قریب ہی گاؤں میں ناگپا درزی اور
... نائی رہتی ہے (جو پتی ورتا ہے) اگر اُن کے ہاتھوں ہمناباد کا سنگِ بنیاد
رکھوائیں گے تو ہمناباد بس جائے گا۔ چنانچہ راجہ نے ایسا ہی کیا۔ راجہ نے سب سے
پہلے رشتوں کے ساہوکاروں اور وہاں کے عام لوگوں کو بسایا۔ راجہ نے اُنہیں مکانات
کے لیے مفت زمین دینے کے علاوہ دیگر کئی سہولتیں مہیا کیں۔ ۱۲ سال تک
ہر قسم کا ٹیکس بھی معاف کیا۔

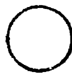
اس وقت ہمناباد کی فصیل اپنے آثار کھو چکی ہے۔ ٹوٹی پھوٹی حالت میں ہے۔
لوگوں نے اپنے مکانات کی تعمیر کے لئے فصیل سے کالے پتھر نکال لئے ہیں۔ فصیل کے
اندر نو محلے آباد ہیں، اُن کے نام یہ ہیں۔ محلہ کفر توڑ، باغبان محلہ، بی بی الاوہ،
توپ گلی اور سید محلہ۔ فصیل کے باہر جو محلے آباد ہیں، اُن کے نام یہ ہیں، محلہ شیوئیہ،
محلہ قصاب، محلہ گاؤ قصاب، محلہ زیر پیٹ اور محلہ نور خاں اکھاڑہ۔ ہمناباد کی
جامع مسجد بہت قدیم ہے جو محلہ توپ گلی سے متصل ہے۔ ہمناباد کی آبادی اس وقت
تقریباً ۳۰ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں، زراعت
بھی کرتے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی کا تناسب تقریباً برابر ہے۔ لوگ
آپس میں فرقہ وارانہ یکجہتی کے ماحول میں رہتے ہیں۔ یہاں کبھی بھی فرقہ وارانہ فسادات

نہیں ہوئے، ہندو مسلم آپس میں شیر و شکر کی طرح رہتے ہیں۔ یہاں کے روزمرّہ کی زبان اُردو اور کنڑی ہے۔ یہاں کے رہنے والے اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے شریفانہ زندگی گذار رہے ہیں۔

میرے بزرگ خاندان، حضرت سیّد قطب الدین حسینی بخاریؒ کے معتقدین میں سے تھے، جن کے ہمراہ وہ بیدر سے ہمناباد آئے تھے۔ ہمناباد میں بسنے والے مسلمانوں کا پہلا خاندان میرا ننھیال ہے۔ میرے پڑنانا جناب محی الدین ریشم کی تجارت کرتے تھے۔ میرے جدِ اعلیٰ تاجر تھے، بعد وہ زمین دار بھی ہو گئے۔

حضرت سیّد قطب الدین حسینی بخاریؒ، راجہ رام چندر کی خواہش پر بیدر سے ہمناباد آئے۔ راجہ رام چندر، حضرت سیّد قطب الدین حسینی بخاریؒ کا عقیدت مند تھا۔ ہمناباد میں رہنے کے لئے اُس نے انہیں ایک مکان بنواکر دیا اور عبادت کے لئے ایک مسجد بنوائی۔ مسجد کے متصل ایک چبوترہ پر محرم میں علم ایستادہ کئے جاتے تھے، جس کی روشنی وغیرہ کے انتظامات خود راجہ کرتا تھا۔

حضرت سیّد قطب الدین حسینی بخاریؒ پہلے مسلمان ہیں جو ہمناباد میں سب سے پہلے تشریف لائے۔ انہوں نے اپنے محلہ کا نام محلہ کفر توڑ رکھا۔ ان کی آخری آرام گاہ محلہ کفر توڑ کی مسجد کے احاطہ میں ہے۔ اِس خاندان کے دو بزرگ بھی یہیں مدفون ہیں۔



تعلقہ ہمناباد (ضلع بیدر) میں ہمارا خاندان ابراہیم بھائی کے نام سے مشہور ہے۔ میرے دادا سراج الدین کے سات بیٹے تھے اور تین بیٹیاں جناب بی، کریم بی اور فیضن بی تھیں۔ میرے والد محترم الحاج محمد شمس الدین اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے جو ابتداء میں ریشم کی تجارت کرتے تھے ہمناباد کے آس پاس کے بیوپاری اُن سے ریشم خرید لیا کرتے تھے۔ میری دادی وزیر بی صاحبہ میرے والد کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ میرے والد اپنی اماں کی بہت زیادہ خدمت کرتے تھے، شائد یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انہیں نہایت خوشحال اور نیک نام رکھا۔ ان کے کاروبار میں روز بروز ترقی ہوتی گئی۔

میرے والد ہمناباد کے اولین حاجیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ حج کے سفر میں اُن کے ہمراہ ہمناباد کے دو اور اصحاب محمد حسین اور عبدالقادر صاحب تھے۔ حج سے واپسی کے بعد میرے والد اور ان کے دوست محمد حسین صاحب نے مشترکہ طور پر کپڑے کی تجارت شروع کی۔ والدِ محترم نہایت دیانت دار، نیک دل، ایماندار اور خداترس انسان تھے، جو میرے محلہ کفر توڑ الاوہ کی مسجد کے پیش امام اور خطیب تھے۔ وہ جامع مسجد ہمناباد میں بھی امامت کرتے تھے۔ اُن کا زیادہ تر وقت مذہبی مصروفیات، فلاحی کاموں اور عبادت میں گذرتا تھا۔ میرے والد کی تین بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی کا نام بی بن بی، دوسری بیوی

کا نام قاسم بی اور تیسری بیوی کا نام رقیہ بی تھا۔ میری سوتیلی والدہ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ہم تمام بھائی بہن والدِ محترم کی تیسری بیوی رقیہ بی کی اولاد ہیں۔ میرے والد نے میری پھوپی فیض بی کے اصرار پر اولاد کی خاطر تیسری شادی کی تھی۔ چار بہنیں مجھ سے بڑی ہیں، دوسری بہن وزیر النساء کا انتقال ہو چکا ہے ہم چار بھائی الحمدللہ بقید حیات ہیں۔ میرے والد کی تعلیم مذہبی ماحول میں ہوئی تھی، وہ اپنی نیک خصلت، شرافت، مروت اور رحمدلی کی وجہ سے حاجی صاحب کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کا ہاتھ بہت کشادہ تھا۔ وہ غریبوں، بےکسوں اور ضرورت مندوں کی مدد کیا کرتے تھے۔

میری والدہ رقیہ بی کی تربیت میں میری پھوپی فیض بی کی دلچسپی کو بہت زیادہ دخل رہا ہے۔ میری والدہ اُن کے دیور عبدالحمید کی بیٹی تھیں۔ میرے چار بہنوئیوں میں دوسرے بہنوئی عبدالحق صاحب میرے پھوپی زاد بھائی بھی تھے جو میرے والد کے انتقال کے بعد ہمارے سرپرست رہے اور والد کی تجارت کے کاروبار دیکھ لیا کرتے تھے۔ جب میرے والد کا ۴۰، ۴۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا تو میری عمر ۵ یا ٦ برس کی ہوگی۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ اُس رات گھر کے ایک کمرہ میں مجھے سلایا گیا تھا۔ میرے والد کا انتقال حیدرآباد میں ہوا، جنھیں ہمنا باد سے علاج کے لئے حیدرآباد لے جایا گیا تھا۔ میں نے اپنے والد کی صورت بھی نہیں دیکھی، البتہ ان کی شبیہ کی ایک جھلک میری نظروں میں موجود ہے۔ جو غالباً یہ ہے خوبصورت اور صحت مند انسان تھے۔ والدِ محترم کے انتقال کے بعد میرے ماموؤں اور پھوپی زاد بھائیوں نے مجھ جیسے کی سرپرستی کی (اُن کی سرپرستی صرف

تربیت کی حد تک تھی) معاشی سرپرستی کا سوال اس لئے نہیں تھا کہ میرے والد کے پاس وہ سب کچھ تھا جو ایک خوشحال خاندان کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے۔

میرے ددھیال کے زیادہ تر لوگ زمیندار اور زراعت پیشہ تھے لیکن اب زیادہ افراد تجارت پیشہ بن گئے ہیں، کچھ افراد سرکاری ملازم بھی ہیں۔ ددھیال کے افراد میں غلام نبی، لیسین علی، شان علی، محمد حسین، امیر الدین، مستان علی، عبدالقادر، حبیب الدین، نصیرالدین، عبدالکریم، محمد حنیف، محمد اسمٰعیل، حسام الدین، علیم الدین، نعیم الدین، مجیب الدین اور غوث محی الدین قابل ذکر ہیں۔ ہمارا گھر ددھیال کے تمام افراد خاندان کے مقابلے میں زیادہ خوش حال اور معاشی اعتبار سے مستحکم رہا۔ میرے تمام تایاؤں کی تعلیم مذہبی تعلیم کی حد تک محدود رہی۔ البتہ میرے پہلے اتالیق میرے ایک تایا حیدر علی نسبتاً زیادہ پڑھے لکھے تھے لیکن ان کی تعلیم بھی دینیات اور اخلاقیات کے زمرہ سے تعلق رکھتی تھی۔ میرے بچپن میں ہمنا باد میں صرف ایک تانگی مڈل اسکول تھا جس کے بانی محمد عبدالسلیم صاحب تھے۔ ہمنا باد کے لوگوں میں تعلیمی شعور پیدا کرنے کے سلسلے میں عبدالسلیم صاحب نے ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا تھا۔

میرا ننھیال پیشکار صاحب کے گھرانے کے نام سے مشہور ہے۔ میرے نانا عبدالحمید صاحب کا تعلق پیشہ طبابت سے تھا۔ میرے پھوپا محمد خواجہ میرے نانا کے بڑے بھائی تھے وہ وقارالامراء پائیگاہ کے پیش کار تھے۔ میرے پانچ ماموؤں میں بڑے ماموں عبدالمجید صاحب کا انتقال ہو چکا ہے (علی الدین نوید اور ڈاکٹر جلیل تنویر ان ہی کے نواسے ہیں) یہ تحصیل ہلی کھیڑ پائیگاہ میں صیغہ دار تھے اور انھیں تحصیل

نارائن کھیڑ سے وظیفۂ حسنِ خدمت جاری ہوا تھا۔ ان کے پانچ بیٹے مقبول احمد، عبدالصمد، عبدالسلام، عبدالرفیق اور عبدالجمیل اور چھ بیٹیاں عظمت بانو (والدہ علی الدین نوید)، فیض بانو (والدہ ڈاکٹر جلیل تنویر)، امیر بانو، حوران بانو، حشمت بانو اور سلیمہ بانو ہیں۔ دیگر تین ماموؤں میں عبدالوحید صاحب کے دو بیٹے قطب الدین، رفیع الدین اور تین بیٹیاں رحیم النساء (اہلیہ فیاض الدین) خالدہ بیگم، ساجدہ بیگم ہیں۔ تیسرے ماموں عبدالحق صاحب کے سات بیٹے شمس الحق، نورالحق (مرحوم)، نورالحق، قیام الحق، عمادالحق، ضیاءالحق، مظہر الحق اور تین بیٹیاں حمیدہ بانو، شمیم سلطانہ اور فریدہ النساء ہیں۔ چوتھے ماموں عبدالخالق صاحب کو ایک بیٹا وصی الحق اور ایک بیٹی سجیدہ بانو ہے۔ میری تین خالاؤں حلیم بی، مریم بی اور احمد بی کا انتقال ہو چکا ہے۔

ننیہال کے افرادِ خاندان میں عبدالرزاق پیش امام، عبدالواحد، عبدالقیوم، عبدالرشید، عبدالواحد، عبدالغنی، عبدالعزیز، عبدالسلیم، قمرالدین، کریم الدین، علیم الدین اور عبدالغفار (فقیر صاحب) قابلِ ذکر ہیں۔ اللہ شریف میں میرے رشتے کے دو ماموں عبدالسلیم صدر مدرس اور بشیرالدین تاجر تھے۔ عبدالسلیم پاکستان چلے گئے ان کے چار بیٹے امین الدین، سید احمد محی الدین، تاج صلاح الدین اور ستا، لڑکیوں میں رضیہ اور زاہدہ ہیں۔ بشیرالدین صاحب اللہ میں ہی پیوند خاک ہو گئے۔ ان کے تین بیٹے ظہیرالدین، منیرالدین اور نصیرالدین اور دو بیٹیاں ہیں۔

پھوپی زاد بھائیوں میں عبدالحفیظ، الحاج محمد حبیب الدین، الحاج عبدالغفور، الحاج عبدالشکور اور الحاج غوث محی الدین شامل ہیں، جن میں اول الذکر تین پھوپی زاد بھائیوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ عبدالحفیظ محکمۂ پولیس (حیدرآباد) میں محرر تھے۔

جن کے تین لڑکے عبدالعزیز (مرحوم)، خواجہ معین الدین اور عبدالسلیم ہیں۔ پانچ
لڑکیوں میں بی جانی، پاشاہ بی، لطیفہ، سلیمہ اور عائشہ شامل ہیں۔ عبداللطیف صاحب
کی دو بیویاں (صاحب بی اور حنیفہ بی) تھیں۔ میرے خسر الحاج محمد حبیب الدین
الندشریف (ضلع گلبرگہ) میں عدالتِ منصفی میں عہدہ دار تھے جو وظیفہ حسنِ خدمت
پر سبکدوشی کے بعد ہمناباد کے محلہ شیوپور کی مسجد حرم کے پیش امام مقرر ہوئے
اس مسجد میں وہ چھوٹے بچوں اور بچیوں کو ابتدائی دینی و مذہبی تعلیم دیتے تھے۔
الحاج عبدالغفور حکیم اور تاجر ہونے کے علاوہ محلہ کفر توڑ کی مسجد کے پیش امام تھے
الحاج عبدالشکور ایک کامیاب تاجر ہیں۔ غوث محی الدین صاحب (میرے بڑے بہنوئی)
سرکاری ملازم تھے۔ میرے ننھیال میں دس افراد کو حج بیت اللہ اور زیارت بارگاہِ
مصطفویؐ کا شرف حاصل ہو چکا ہے، جن کے نام یہ ہیں۔ محمد خواجہ، عبدالمجید،
محمد حبیب الدین، عبدالشکور، عبدالغفور، غوث محی الدین، عبدالحق، محمد ظہیر الدین
(فرزند غوث محی الدین)، واجدہ بی (اہلیہ عبدالشکور) ساجدہ حور النساء (اہلیہ غوث محی الدین)

میرے والد الحاج محمد شمس الدین کی اولاد میں چار بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں۔
تمام بہنیں مجھ سے بڑی ہیں (جن میں سے ایک بہن وزیر النساء کا انتقال ہو چکا ہے)۔
چار بیٹوں میں صلاح الدین نیر، محمد ضیاء الدین، محمد فصیح الدین، محمد فیاض الدین،
اور بہنوں میں حور النساء، وزیر النساء، حلیمہ بی اور قریشہ بی ہیں۔ بھائیوں میں
سب سے بڑا میں ہوں۔ میرا دوسرا بھائی محمد ضیاء الدین ریاست کرناٹک کے تعلقہ
سیڑم (گلبرگہ) میں بحیثیت منیجر بلاک ڈیولپمنٹ ڈپارٹمنٹ سے وابستہ رہا ہے۔
اس کی شادی میری پہلی والدہ بی بن بی کے بھائی محمد اسمٰعیل متوطن چنگوپہ کی دوسری

لڑکی عنبیہ بیگم سے ہوئی ۔ ضیاء الدین کے چھ بیٹے شجاع الدین شکیل، رفیع الدین جمیل، غیاث الدین عقیل، شہاب الدین قتیل، علیم الدین عدیل، عماد الدین عتیق، اور چھ بیٹیاں نصرت رضوانہ (اہلیہ محمد ظہیر الدین)، ریحانہ رفعت، عظمت شاہانہ (اہلیہ خواجہ عین الحق)، نکہت فاطمہ (اہلیہ شجاع الدین)، بشارت تحسین، آسیہ تسکین ہیں۔ شجاع الدین شکیل کا رشتہ میرے ایک رشتہ کے ماموں غلام رسول صاحب کانگی کی بیٹی غوثیہ بیگم سے ہوا، جن کے چار بیٹے، سیف الدین، وجیہہ الدین فراز، نعیم الدین معراج، سراج الدین اور ۴ بیٹیاں تبسم، زیبا، نازیہ، اسمیٰ ہیں۔ رفیع الدین جمیل کا رشتہ میری بیٹی عشرت عرفانہ سے ہوا، جس کے چار لڑکے مصباح الدین سہیل، مفتاح الدین فضیل، فلاح الدین فیصل اور راحیل ہیں۔ غیاث الدین عقیل کا رشتہ میرے رشتہ کے بھتیجے غوث محی الدین کی بیٹی صبیحہ سلطانہ سے ہوا جنہیں ایک لڑکا شمس الدین فیضان ہوا۔

میرا تیسرا بھائی فصیح الدین ہمنا باد میں رہتا ہے۔ وہ تجارت کرنے کے علاوہ آبائی زراعت کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ فصیح الدین کی شادی میرے والد محترم کے بزنس پارٹنر اور سفر حج بیت اللہ کے ساتھی محمد حسین صاحب کے بڑے صاحبزادے محمد شفیع کی بڑی لڑکی خیر النساء سے ہوئی جن کے تین بیٹے مسیح الدین محمود، معز الدین، علی الدین اور چھ بیٹیاں فرحت فرحانہ، راحت رخسانہ، نزہت نزیبہ، عائشہ پروین، حنا جبین اور حمیرہ ہیں۔ مسیح الدین محمود کی شادی عبد الحمید صاحب کی دختر فرزانہ سے ہوئی، انہیں ایک بیٹا عبد اللہ زبیر اور ایک لڑکی اسریٰ ہے۔

میرا چوتھا بھائی محمد فیاض الدین ساؤتھ سنٹرل ریلوے سکندرآباد سے وابستہ

ہے، جہاں انجینئر سکشن میں ہیڈ ڈرافٹسمین کی حیثیت سے کارگذار ہے۔ فیاض الدین کی شادی میرے تیسرے ماموں عبدالوحید کی بیٹی رحیمہ سے ہوئی۔ ان کے دو لڑکے صفی الدین (انجینئر) اور ذکی الدین ہیں، اور ایک لڑکی انیس فاطمہ (ریشماں) ہے۔

ہمتا باد میں ہمارا گھر ایک باڑے کی شکل میں ہے۔ میری دوسری والدہ قاسم بی صاحبہ کی حیثیت ایک سربراہ خاندان جیسی تھی جو ہماری برادری کے تمام چھوٹے بڑے مسائل کو سلجھایا کرتی تھیں۔ خاندان کی خواتین اور محلہ کی دوسری خواتین اپنے گھریلو مسائل کے سلسلہ میں میری والدہ سے مشورہ کیا کرتی تھیں۔ جاڑے کی راتوں میں میری والدہ انگیٹھی سلگا کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے اطراف خاندان کی خواتین گھنٹوں بیٹھی رہتی تھیں۔ یہ سلسلہ ۹ بجے شب سے شروع ہو کر رات کے تقریباً ۱۲ بجے تک چلتا رہتا۔ میری والدہ بارعب اور پُروقار شخصیت کی مالک تھیں۔ میرے گھر کی ایک خاص بات سارے قبیلے اور سارے ہمتا باد کے لئے مثالی تھی اور وہ یہ کہ تینوں والدہ کے آپس میں ہمیشہ خوشگوار تعلقات رہے، وہ سب ہنسی خوشی کے ساتھ مل جل کر رہا کرتی تھیں۔ ہم تمام بھائی، بہنیں اپنی دونوں ماؤں کے لیے حد لاڈلے تھے۔ ہم نے کسی وقت بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ہماری کون سی ماں حقیقی ہے اور کون سی سوتیلی۔ ہم سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنی حقیقی ماں کے ساتھ ساتھ ان دونوں سوتیلی ماؤں کو بھی بے حد چاہتے تھے، وہ دونوں بھی ہم سب کو ٹوٹ کر چاہتی تھیں۔ میری بڑی والدہ بی بن بی نہایت خوبصورت، دُبلی پتلی نازک، اوسط قد کی خاتون تھیں جن کا میرے بچپن میں انتقال ہوا۔ وہ میری بڑی بہن عمدۃ النساء کو نسبتاً زیادہ چاہتی تھیں۔ بڑی بہن زیادہ تر

انہیں کے پاس رہتی تھیں، اسی طرح میری دوسری ماں قاسم بی میری دوسری بہن وزیرالنساء کو بہت چاہتی تھیں مگر مجھے دونوں والدہ بے حد عزیز تھیں۔ میری بڑی والدہ چٹگوپہ (معین آباد) کی رہنے والی تھیں۔ میرے معین آباد کے رہنے والے ماموں محمد اسمٰعیل کپڑے کے بیوپاری تھے جو میرے بچپن میں کپڑا فروخت کرنے کے لئے ہمنا باد کے بازار کے دن آتے تھے اور ہمارے ہاں ٹھہرتے تھے۔ کبھی کبھی میں اُن کے ہمراہ اُن کے گھوڑے پر بیٹھ کر چٹگوپہ چلا جاتا تھا۔ چٹگوپہ کا فاصلہ ہمنا باد سے چھ میل کا ہے۔ ہر سال وہاں کے بزرگ حضرت کریم اللہ قادریؒ اور حضرت سالار مخدومؒ کا شاندار پیمانے پر عرس ہوتا تھا۔ میں تقریباً ہر سال عرس شریف کی تقاریب میں ضرور شرکت کرتا تھا۔

چٹگوپہ میں میرے ماموں کے پڑوسی کے پاس مختلف رنگ کے کبوتر تھے۔ میں جب بھی جاتا وہاں سے دو چار کبوتر اپنے ساتھ لے آتا۔ مجھے سفید کبوتر بے حد پسند تھے۔ اپنے گھر سے متصل اپنے چچا غلام نبی صاحب کے گھر کے بڑے نیم کے درخت پر ہانڈیاں اور گھرے بندھواتا اور انہیں اُن میں رکھواتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کبوتروں کا اضافہ ہو جاتا۔ جب کبوتر اُڑ جاتے تو اپنے ہمراہ ایک دو کبوتر ضرور لاتے۔ ان کبوتروں میں ایک کبوتر جو سفید رنگ کا تھا اور جس کے پاؤں نہایت سُرخ تھے۔ میں نے جھانجھن باندھے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی میرے کاندھے پر بیٹھ جاتا تھا، اُس سفید کبوتر کو مجھ سے لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جبکہ میری عمر بمشکل ۱۲، ۱۳ برس کی ہوگی۔ میرے ماموں محمد اسمٰعیل کے پانچ بیٹوں محمد یوسف، محمد مستان، محمد شانج، محمد جعفر اور محمد نعودار میں

سے ایک بیٹا محمد جعفر جنیدی پاکستان کا شہری ہے۔ دو بیٹیاں زبیدہ بیگم اور عبیدہ بیگم ہیں۔ چٹگوپہ میں میرے بہت ہی اچھے پانچ دوست تھے، اُن میں سے ایک تحصیل دار کا لڑکا تھا، دوسرا ایک مشہور وکیل عنایت اللہ کا بیٹا باری، تیسرا چٹگوپہ کے قاضی کا لڑکا میر خان تھا، چوتھا میری ممانی زینب بی کی بہن کا لڑکا خواجہ معین الحق جس کے والد عبدالرحیم سرکل انسپکٹر پولیس تھے اور پانچواں میرا ماموں زاد بھائی جعفر جنیدی۔ چٹگوپہ میں ان دوستوں کے ساتھ میرا زیادہ وقت گذرتا تھا۔ (حیدرآباد آنے کے بعد چٹگوپہ کے ایک اور ساتھی عبدالرحیم سے میری شناسائی بڑھی)۔ میری بڑی والدہ نے اپنے خاندان کے تسلسل کیلئے اپنے بھائی کی دوسری لڑکی عُبیدہ بیگم سے میرے دوسرے بھائی محمد ضیاء الدین کا رشتہ کیا۔ میرے بچپن ہی میں میری دونوں والدہ کا انتقال ہوگیا۔ پولیس ایکشن کے بعد میری بڑی والدہ کے خاندان کے بیشتر افراد حیدرآباد آ گئے۔ میری دوسری والدہ قاسم بی ہمنا باد کے ایک محلہ توپ گلی کے ایک میرزا خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے خاندان کے افراد اب بھی اُسی محلہ میں رہتے ہیں، جو میرزا گھرانے کے نام سے مشہور ہیں۔ جن میں قابلِ ذکر میرزا نصیر بیگ، مہتاب بیگ، ڈاکٹر منیر بیگ، ریحان بیگ، احمد بیگ، محمد بیگ، مختار بیگ، ڈاکٹر فاروق بیگ، انور بیگ وغیرہ ہیں۔

میری دوسری والدہ قاسم بی نے اپنے خاندانی سلسلہ کو استوار رکھنے کے لئے اپنے ایک رشتہ دار کے لڑکے میرزا مہتاب بیگ سے میری تیسری بہن حلیمہ بی کی شادی کرادی۔ میری بڑی بہن نور النساء میرے پھوپی زاد بھائی غوث محی الدین کے رشتہ ازدواج میں آگئیں۔ دوسری بہن وزیر النساء میرے

پھوپی زاد بھائی عبدالحق صاحب سے منسوب ہوئیں۔ چوتھی بہن قریشہ بی محلہ بی بی لالاہ کے رہنے والے عبدالجلیل صاحب سے منسوب ہوئیں جو میرے بہنوئی میرزا مہتاب بیگ کے رشتہ دار تھے۔ میری بڑی بہن حورالنساء کے دو بیٹے اور چھ بیٹیاں ہیں۔ پہلا لڑکا محمد ظہیرالدین (مقیم ہمناباد) ڈپلوما ہولڈر میکانک ہے جس کی شادی میری بھتیجی نصرت رضوانہ (دختر محمد ضیاءالدین) سے ہوئی۔ اس کے ۴ لڑکے اظہر محی الدین، اطہر محی الدین، مظہر محی الدین اور ظفر محی الدین، دو لڑکیاں زینت فرزانہ اور حمیرہ بتول ہیں۔ دوسرا لڑکا محمد مظہرالدین حیدرآباد میں مقیم ہے جو بزنس مین ہے، جس کی بیوی شہناز بانو ہمارے ایک رشتہ دار غلام جیلانی کی لڑکی ہے۔ ان کے پانچ لڑکے عرفان محی الدین، رضوان محی الدین، عمران محی الدین، فرحان محی الدین اور امان محی الدین ہیں۔ میری بہن حورالنساء کی چھ بیٹیوں میں حافظ بانو، سردار بانو، افضل بانو، مختار بانو، بلقیس بانو اور نثار بانو شامل ہیں۔ میرے بہنوئی الحاج غوث محی الدین حیدرآباد میں مقیم ہیں، سرکاری ملازمت سے وظیفۂ حسن خدمت حاصل کرنے کے بعد خانگی طور پر کچھ تجارت پیشہ حضرات کے کھاتوں اور حساب کتاب کی تنقیح کیا کرتے ہیں۔ غوث محی الدین محکمۂ بندوبست میں انسپکٹر لینڈ ریکارڈ تھے۔

میری دوسری بہن وزیرالنساء کو ایک بیٹے خواجہ معین الحق کے علاوہ ایک بیٹی سلیمہ ہوئی۔ خواجہ معین الحق محکمۂ مال ضلع بیدر میں گرداور کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ ان کی بیوی سلیمہ، غلام رسول صاحب کانگی کی دوسری بیٹی ہے۔ انہیں تین لڑکے انیس، رئیس، اعجاز اور چھ بیٹیاں کلیم، فہیم، وسیم، عتیقہ، ریشمہ اور مسرت

ہیں۔ میری بھانجی سلیمہ ۲۵ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی، وہ لاولد ہے۔ وہ اس قدر شوہر پرست ہے کہ اُس نے دوسری شادی نہیں کی۔ وہ اپنے بھائیوں کے پاس علٰحدہ رہتی ہے۔ سلیمہ کی ماں وزیرالنساء کے انتقال کے بعد خاندان کے بزرگوں کے اصرار پر اس کے والد عبدالحق صاحب نے دوسری شادی کی۔ دوسری بیوی صغرابی سے چھ لڑکے خواجہ عین الحق، خواجہ مجیب الحق، خواجہ امین الحق، خواجہ نجیب الحق، خواجہ نورالحق اور خواجہ محب الحق ہوئے اور ایک لڑکی حلیم النساء پیدا ہوئی۔ خواجہ عین الحق کا رشتہ میرے چھوٹے بھائی محمد ضیاء الدین کی بیٹی عظمت شاہانہ سے ہوا جو ایک تاجر کی حیثیت سے خوشحال ہے۔ اُنہیں ایک لڑکا خواجہ عبدالحق جنیدی اور ایک لڑکی وزیرالنساء شاہ ہے۔

میری دوسری بہن وزیرالنساء کا انتقال کم عمری میں ہی ہوگیا، شاید اُس وقت وہ بمشکل ۲۴، ۲۵ سال کی ہوگی۔ اُس کو مرگی کی بیماری تھی۔ مرگی کا دورہ پڑنے کے بعد اپنے گھر کی چھت سے گرگئی اور اس کا انتقال ہوگیا۔ وہ اپنی دوسری بہنوں کی طرح رمضان شریف میں ۳۰ دن روزہ رکھتی تھی۔ کلام پاک اتنی تیزی اور روانی سے پڑھتی تھی کہ بعض دفعہ ایک ہی دن میں کلام مجید ختم کرلیتی تھی۔ رمضان شریف میں کلام پاک کے کم از کم ۱۵ دور ہوتے تھے۔

میری تمام بہنوں میں وہ صحت مند اور خوبصورت تھی لیکن بلا کی ضدی تھی۔ ایک دن میری والدہ سے خفا ہوکر میرے چچا غلام نبی صاحب کے گھر میں موجود بہت اونچے نیم کے درخت پر چڑھ کر بالکل آخری ٹہنی کے قریب بیٹھ گئی۔ خاندان کے بہت سے لوگ جمع ہوگئے۔ بہت دیر تک سمجھانے کے بعد درخت سے

نیچے اُتری۔ اِس طرح ایک اور واقعہ مجھے یاد ہے کہ میری والدہ کی ڈانٹ ڈپٹ پر ہمارے محلہ سے باہر ایک ویران شکستہ مکان کے تورو پودوں کے درمیان گھنٹوں چھپی رہی۔ دن بھر تلاش کیا گیا، آخرکار سرِشام اُس کو مذکورہ شکستہ مکان سے ڈھونڈ نکالا گیا۔ تمام بہنوں میں ذرا مختلف ہونے کی وجہ سے گھر کے تمام لوگ اس کو بیٹا سمجھتے تھے۔ میری تیسری بہن حلیمہ، نہایت حلیم الطبع اور منکسر المزاج، خاموش طبیعت خاتون ہیں، اُن کے دو بیٹے مرزا خواجہ بیگ اور مرزا مصطفےٰ بیگ اور چار بیٹیوں میں رضیہ بیگم، فوزیہ بیگم، غوثیہ بیگم اور ذکیہ بیگم شامل ہیں۔ میری چوتھی بہن قریشہ بیوہ ہے، اس کے مکمل اخراجات کی پابجائی ہم بھائیوں کے تعاون سے ہوتی ہے۔ قریشہ کو ایک لڑکا اسمٰعیل (حاجی میاں) ہوا تھا، جس کا انتقال ہو چکا ہے۔ دو بیٹیاں حشمت بی اور رشیدہ بی اپنے سسرال میں خوش ہیں۔

میرے بزرگوں میں میرے ایک تایا زاد چچا غلام نبی صاحب زمیندار میرے والد کے انتقال کے بعد میرے ماموؤں اور پھوپی زاد بھائیوں کی طرح ہم لوگوں کا خیال رکھتے تھے۔ میرے والد اُنہیں بہت چاہتے تھے۔ میرے چچا کی بہت بڑی زمین ہے جس پر کاشت کی جاتی ہے اور آم کے بہت سے درخت ہیں۔ چچا کے انتقال کے بعد اُن کے بڑے بیٹے عبدالکریم اپنے گھر کے سرپرست ہوئے۔ اُن کے دو بھائی تاج الدین اور عبدالرحمٰن اپنے اپنے انداز سے زندگی گذار رہے ہیں۔ عبدالرحمٰن ملازم سرکار ہے۔ میرے چچا زاد بھائی عبدالکریم نے منشی نظامیہ تک تعلیم پائی۔ میری بھابی (والدہ تھا عبدالنعیم

بیدر کے ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ میرے بھائی عبدالکریم محلہ شیدپورہ (محلہ قریش) کی ایک مسجد میں امامت کرتے ہیں اور محلے کے بچوں کو دینی و اخلاقی تعلیم دیتے ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے عبدالفہیم کی میری بڑی لڑکی طلعت سلطانہ سے شادی ہوئی۔ عبدالکریم صاحب کے دوسرے بیٹوں میں محمد شعیب، محمد ظہیر، کلیم الدین، افضل الدین، عارف الدین اور آصف الدین شامل ہیں۔
کلیم الدین کی شادی حلیم النساء بنت عبدالحق جنیدی سے ہوئی۔ عبدالکریم صاحب کی تین بیٹیاں نور جہاں، یاسمین آرا اور رضوانہ بیگم ہیں۔ میرے ایک پھوپی زاد بھائی بشیر احمد جنیدی ہمارے خاندان کے مستعد اور متحرک افراد میں شمار کئے جاتے تھے، وہ میری بے حد حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ خاندان کے لڑکوں اور لڑکیوں کے رشتوں کی تلاش میں خاصی دلچسپی لیتے تھے۔ خاندان کے لڑکے اور لڑکیاں اُن کی نظر عنایت کے منتظر رہتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ خاندان کی لڑکیاں اُن کو دیکھتے ہی چُھپ جاتی تھیں تاکہ اُن پر اُن کی نظر نہ پڑے اور انہیں جلد اپنا میکہ چھوڑنا پڑے۔ ان کے بڑے لڑکے نذیر احمد سے میری بھانجی حافظہ بانو بیاہی گئی۔ بشیر احمد کا ایک اور بیٹا اقبال احمد محکمہ ٹرانسپورٹ سے وابستہ ہے۔ میری ایک تائیری پھوپی عزیزبی (ہمشیرہ غلام نبی)، مجھے بے حد عزیز تھیں، میں اپنے بچپن میں ان کے گھر بہت زیادہ جایا کرتا تھا۔ وہ میری خاطر تواضع میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتی تھیں۔
میرے پھوپا عبدالقادر صاحب پر میرے والد کی خاص نظر کرم تھی۔ وہ والد محترم کی زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی ہمارے گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتے

رہے۔ بہ الفاظ دیگر ہم تمام بہنوں اور بھائیوں کی ذمہ داری کے ساتھ نگرانی کرتے تھے۔ ان کا ایک بیٹا محمد شفیع میرے اولین دوستوں میں سے ہے، جو تجارت کے علاوہ مذہبی، دینی معاملات میں معروف رہتا ہے۔ میرے رشتہ کے ایک ماموں غلام رسول صاحب بھی ہمنا باد کے تاجروں میں ایک اچھی پوزیشن کے مالک ہیں۔ میری پھوپی فیضن بی کے بیٹوں میں الحاج محمد عبدالغفور، ہر دل عزیز اور ایک معتبر انسان ہونے کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد کی ایک روشن علامت تھے۔ پُروقار، صلح جو اور معاملہ فہم تھے۔ خاندان میں ان کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ تاجر بھی تھے اور حکیم بھی۔ رمضان شریف میں محلہ کفر توڑ کی مسجد میں تراویح کی نماز پڑھاتے تھے۔ وہ اس مسجد کے پیش امام بھی تھے۔ بہت ہی متاثر کن اور اثر انگیز لحن میں نماز پڑھاتے تھے۔ ان کی دو بیویاں تھیں، زینب بانو اور زیتون بیگم۔ زینب بانو کی ایک لڑکی خورشید بانو کا ۱۱/۱۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ بچپن میں وہ مجھے دوسری ماموں زاد بہنوں کے مقابلے میں زیادہ اچھی لگتی تھی۔ زیتون بیگم کے کوئی لڑکا نہیں ہوا، البتہ انہیں پانچ لڑکیاں قمر بانو، ظفر بانو، فاطمہ بانو، میمونہ اور صوفیہ ہیں۔ میرے ایک اور ماموں الحاج حبیب الدین (میرے خسر) تعلقہ الند شریف ضلع گلبرگہ کی عدالت منصفی میں سینہ دار تھے۔ انہوں نے اپنی تمام ملازمت نیک نامی کے ساتھ گذار دی۔ وظیفہ کے بعد انہوں نے ہمنا باد میں تجارت شروع کر دی۔ وہ محلہ شیخ پور کی مسجد حرم کے پیش امام بھی رہے، جہاں بچوں کو دینی اور اخلاقی تعلیم دیتے تھے۔ وہ ایک صوفی منش اور مجذوب صفت

انسان تھے۔ انہیں ایک بیٹا ہے۔ ہاشم معزالدین جن کی شادی محلہ بی بی الاوہ کے ایک تاجر جناب عبدالحنان کی بیٹی عطیہ بیگم سے ہوئی۔ میرے ماموں الحاج حبیب الدین کی پانچ لڑکیاں ہیں (جن میں رشیدہ بانو (پتلی)، اشرف بانو اور عظمت بانو کا انتقال ہوچکا ہے)۔ ان کی تیسری بیٹی رحمت النساء میری شریکِ حیات ہے۔ ان کی بیٹیوں میں جیلانی بانو بڑی ہیں۔ ہاشم معزالدین کو ایک لڑکا ہے صابر محی الدین، اور پانچ لڑکیاں ذکیہ سلطانہ، نصرت سلطانہ، عشرت سلطانہ، مسرت سلطانہ اور حسرت سلطانہ ہیں۔ نصرت سلطانہ میرے دوسرے لڑکے سراج الدین سلیم کی اہلیہ ہے۔ میرے پھوپھی زاد بھائی الحاج محمد عبدالشکور اپنے تمام بھائیوں میں اس لئے بھی زیادہ خوش نصیب ہیں کہ انہیں آٹھ بیٹے اور ایک بیٹی قیصر سلطانہ ہے جو ڈاکٹر نیاز شیخ سے بیاہی گئی جو گلبرگہ میں ایک نامور ڈاکٹر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ اعظم محی الدین، عبدالحمید اور مخدوم محی الدین تجارت پیشہ ہیں۔ ہمناباد میں رہتے ہیں۔ اعظم محی الدین کی شادی منا الکھیلی (ظہیرآباد) کے گھرانہ پٹیل کی لڑکی طیبہ بیگم سے ہوئی۔ اعظم محی الدین کے پانچ بیٹے معظم محی الدین، کاظم محی الدین، ناظم محی الدین، مکرم محی الدین اور خرم محی الدین اور سات بیٹیاں ریحانہ، فرزانہ، رضوانہ، دردانہ، فرحانہ، شبانہ اور عرفانہ ہیں۔

عبدالحمید کی شادی تانڈور کے ایک سجادہ خاندان کے عبدالقیوم صاحب کی لڑکی زلیخا بیگم سے ہوئی، جنہیں ایک بیٹا زبیر محی الدین اور تین بیٹیاں بشریٰ بتول، اسریٰ بتول، اور حمیرہ بتول ہوئیں۔ مخدوم محی الدین کی شادی عبدالرحمٰن منشی کی لڑکی انیس فاطمہ سے ہوئی، جنہیں تین بیٹے ارشد محی الدین، عدنان اور عرفان ہیں اور ایک بیٹی سُمرن ہے،

ہے۔ ڈاکٹر محمد اکرام الدین محکمہ تعمیرات گلبرگہ میں انجینئر ہیں، پیشہ طبابت سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی اہلیہ سیدہ صفیہ نسرین، جناب سید حسین کی صاحبزادی ہیں، انہیں پانچ بیٹیاں ریحانہ انجم، آمنہ نسرین، عائشہ فاطمہ، عطیہ تبسم، مبصرہ فاطمہ اور ایک لڑکا محمد مصطفیٰ ہے۔

ڈاکٹر لطیف، عبدالشکور صاحب کا ایک قبیلہ پرور بیٹا ہے۔ وہ اپنے بھائیوں، والدین، رشتہ داروں کی کھل کر رقمی مدد کرتا ہے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اس نیکی میں اُن کی بیوی قمر سلطانہ ہم خیال ہے۔ ڈاکٹر لطیف جب اعلیٰ تعلیم کے لئے بھنا باد سے حیدرآباد آئے تو میرے ہاں مقیم رہے، انہیں شدت سے اس بات کا احساس ہے کہ اُن کی تایا زاد بہن (میری اہلیہ) نے حیدرآباد میں اُن کی طالب علمی کے زمانے میں بہت زیادہ خدمت کی ہے۔ جب بھی وہ امریکہ سے حیدرآباد آتے ہیں تو بہن کے لئے ایک خصوصی تحفہ ضرور لے آتے ہیں۔ ڈاکٹر لطیف تقریباً ۱۸ سال سے نیوجرسی (امریکہ) میں مقیم ہیں، جہاں ایک قابل ترین ممتاز ڈاکٹر کی حیثیت سے شہرت کے حامل ہیں۔ ان کے دو لڑکے ڈاکٹر محمد فاروق اور اسلم ہیں۔ لڑکی کا نام نکہت بانو ہے۔ ڈاکٹر لطیف ان برسوں میں صرف ۴ مرتبہ ہندوستان آئے۔ پہلی دفعہ اپنی بہن قیصر سلطانہ کی شادی کے موقع پر دوسری دفعہ ڈاکٹر شفیع کی شادی کے موقع پر، تیسری دفعہ اپنی والدہ کی علالت کی خبر سُن کر، اور چوتھی دفعہ اپنی والدہ کے انتقال کے موقع پر جبکہ وہ قریب مرگ تھیں۔ ان کے ایک اور بھائی ڈاکٹر خواجہ معین الدین بھی نیوجرسی (امریکہ) میں مقیم ہیں۔ انہیں تبلیغی کاموں سے دلچسپی ہے۔ ان کی بیوی نعیمہ مشہور عثمانین پروفیسر عاقل علی خان کی لڑکی ہے۔ ان کے دو لڑکے عمران اور اعتماد ہیں۔ ڈاکٹر محمد شفیع، گلبرگہ میں مشہور و معروف

ڈاکٹر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی بیوی ڈاکٹر شمیمہ بانو، مولوی عبدالرحمٰن حماد کی بیٹی ہے۔ ڈاکٹر شفیع کو دو لڑکیاں بریدہ اور رفیدہ ہیں۔ عبدالشکور صاحب کے بڑے لڑکے احمد محی الدین کا دو سال قبل بعارضہ قلب انتقال ہوگیا، وہ ایک تاجر تھے۔ اُن کی بیوی نجم النساء مولوی عبدالکریم عتیق صدر مدرس مدرسہ یادگیر کی لڑکی ہے۔ ان کے چھ لڑکے حامد محی الدین، عابد محی الدین، قادر محی الدین، خالد محی الدین، شاہد محی الدین اور ارشد محی الدین اور پانچ لڑکیاں کلیم بیگم، نسیم بیگم، وسیم بیگم، فہیم بیگم، شمیم بیگم ہیں۔ عبدالشکور صاحب کا ایک لڑکا فیض الدین ۲۰، ۲۲ سال کی عمر میں لاری کے ایک حادثہ کا شکار ہوگیا۔ ماموں الحاج عبدالحق صاحب (ڈپٹی میئر) ایک اصول پسند، سنجیدہ طبیعت اور محنتی انسان کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ زندگی کے طویل سفر میں تھکن نام کی کوئی چیز انہیں یاد نہیں ہے۔ آج بھی وہ جواہر ٹاکیز ہمنا باد میں منیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ جواہر ٹاکیز ہمارے خاندان کے کچھ افراد اور کچھ دیگر اصحاب کی مشترکہ ملکیت ہے جس میں ہمارا بھی تھوڑا سا حصہ ہے۔

میرے والد کا سلوک میری تینوں والدہ کے ساتھ نہایت منصفانہ رہتا تھا۔ گھر میں ایک ہی چولہا جلتا تھا۔ میں نے اوائل عمر میں ابتدائی اور دینی تعلیم اپنے تایا حیدر علی سے حاصل کی، جو محلہ شیدلود کی مسجد میں نماز فجر کے بعد بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ میرا پہلا دینی مدرسہ وہی مسجد ہے۔ اس وقت کے میرے دوستوں میں محمد علی اور عبدالکریم معشوق قابلِ ذکر ہیں۔ (افسوس ہے کہ ان دونوں کا انتقال ہوچکا ہے)۔ میرے بچپن کے اچھے دوستوں میں

ستار خان ہے جو پاکستان کے شہری ہیں۔ ان کے والد قادر خان منتظم پولیس، میرے پھوپی زاد بھائی الحاج عبدالغفور کے خسر تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں مدرسہ وسطانیہ ہمنا باد میں چوتھی جماعت کا طالب علم تھا تو اس وقت نواب بہادر یار جنگ بہادر اس اسکول کے معائنہ کے لئے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے میری جماعت کا بھی معائنہ کیا تھا اور میرا نام پوچھتے ہوئے سوال کیا تھا کہ صلاح الدین کے کیا معنی ہیں۔ ہمنا باد میں ایک مصلح قوم و ملت جناب عبدالسلیم کی تعلیمی امور سے شخصی دلچسپی کی وجہ سے اسکول قائم ہوا۔ یہ ایک خانگی اسکول تھا، جسے بعد میں حکومتِ وقت سے گرانٹ ملنے لگی اور حکومت کے زیر انتظام یہ اسکول چلتا رہا۔ میں ہر سال کامیاب ہوتے ہوئے جماعت ہفتم تک پہنچ گیا۔ میری تعلیمی حالت بہت اچھی تھی۔ میری تعلیمی حالت سے اساتذہ ... محمد عبدالسلیم صدر مدرس تعلیم کے معاملے میں بہت سخت گیر تھے۔ نماز کی پابندی، اخلاقیات و دینیات کی تعلیم کے معاملے میں طلباء کے ساتھ ان کا رویہ ... سخت تھا۔ اسکول کے باہر ہر صبح جب تعریف پڑھائی جاتی تو تعریف کے بعد اپنی اپنی کلاس میں جانے سے پہلے مسلم طلباء سے کہا جاتا تھا کہ جنھوں نے آج فجر کی نماز پڑھی ہے وہ ایک طرف ہوجائیں اور جنھوں نے نہیں پڑھی وہ دوسری طرف ہوجائیں۔ کوئی طالب علم جھوٹ نہیں بول سکتا تھا، چونکہ ہر محلہ کے طلباء کے لئے ایک استاد نگران ہوتا تھا، جو خود بھی فجر کی نماز پابندی سے پڑھتا تھا اور ... طلباء پر نظر رکھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ عبدالسلیم صاحب نے مجھے ایک ... بائیں ہتھیلی پر بید لگائی تھی، چونکہ اس دن میں نے فجر کی نماز نہیں پڑھی تھی۔

عبدالسلیم صاحب کو اُن دنوں فالج ہوگیا تھا اس کے باوجود وہ بائیں ہاتھ میں بید کی لکڑی پکڑ کر طلبار کو سزا دیتے تھے۔ فالج کی وجہ سے وہ ایک بیل کی بنڈی میں بیٹھ کر اسکول آتے تھے اور بنڈی میں بیٹھ کر ہی شام کے وقت فٹ بال گراؤنڈ (بس ڈپو کے قریب) پہنچ جاتے اور طلبار کا کھیل دیکھا کرتے تھے۔ اُن دنوں فٹ بال کھیلنے کا ہر اسکول میں کچھ زیادہ ہی رواج تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد اسکول کے ایک سینئر اور قابل ترین استاد جناب نبی الحسن فاضل دیوبند، صدر مدرس ہوئے۔ جو مظفر نگر (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ جس اُستاد نے مجھے اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں زیادہ متاثر کیا وہ نبی الحسن صاحب تھے۔ نبی الحسن صاحب اپنے تمام شاگردوں میں مجھے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ وہ اسکول کی دیوار سے متصل ایک مکان میں رہتے تھے۔ جہاں شام میں ان کے خاص شاگرد اُن سے فارسی پڑھتے تھے جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ جب میں ہفتم جماعت کا طالب علم تھا تو فارسی زبان میں گفتگو کرتا اور فارسی میں مضامین لکھتا تھا۔ نبی الحسن صاحب کو شکار کا بہت شوق تھا۔ شام میں اکثر نالے پر چلے جاتے اور ایک دو کبوتر کا شکار کرتے۔ میں اکثر ان کے ساتھ رہتا۔ اُن کے خاص دوستوں میں ہمنا باد کے منتظم پولیس نظام الدین صاحب بھی تھے جو اُن سے ملنے کے لئے کبھی کبھی اُن کے گھر آجاتے (وہ بھی یوپی کے تھے)۔ میرے اسکول کے اساتذہ میں قاسم علی صاحب، سید صاحب، عبدالرشید، علیم الدین، رگھوناتھ، کشن راؤ، محمد اسمٰعیل، عبدالجبار اور اسکول کے ساتھیوں میں شہاب الدین، رشید میاں، خورشید خان، عبدالحق، عبدالغفور، گوبندایا اور ویر بھدرپا اگڑی ایڈوکیٹ قابل ذکر ہیں۔ چونکہ ہمنا باد

بادشاہوں اور راجاؤں کی کہانیاں سُناتی تھیں ۔ مجھے کالی چکنی مٹی سے گائے بیل، گھوڑا، ہاتھی کے علاوہ جوار کے ڈنٹھل کی گاڑیاں بنانا سکھاتی تھیں۔ مجھے پتنگ، بنانے، اُڑانے، کاٹنے اور لوٹنے کا بہت شوق تھا ۔

میرے سرپرستوں کی یہ خواہش تھی کہ میں مرہٹی لکھنا پڑھنا سیکھوں، کیونکہ ہمارے کپڑے کی دوکان کے کھاتے مرہٹی میں لکھے جاتے تھے۔ چنانچہ میں ایک ہندو ماسٹر کے گھر پر اور ایک دیول نگر پشی وریہ پڑھنے کے لئے جاتا تھا۔ ہماری دوکان میں ایک ہندو منیم ــــــ تھا جو کھاتے لکھتا تھا۔ ہر سال دیوالی کے موقع پر آمدنی و خرچ کا حساب ہوتا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد بہنوئی عبدالحق صاحب نے کاروبار سنبھالے۔ ہم نے ذاتی طور پر کبھی زراعت نہیں کی بلکہ شروع ہی سے زمین قول پر دے رکھی تھی ۔ پیداوار کا نصف حصہ ہم کو ملتا تھا۔ جب فصل تیار ہو جاتی تو قول دار نصف اناج لے لیتا اور نصف اناج ہمارے گھر پہونچا دیتا (یہ اس کی ذمہ داری میں شامل تھا)۔ ہمارے کھیتوں میں زیادہ تر جوار کی فصل اُگائی جاتی تھی۔ اُس زمانے کا ایک رواج یہ بھی تھا کہ جس کھیت میں اچھی فصل ہوتی تو راس سے پہلے وہاں کے ایک بزرگ حضرت سید شاہ حسینی ؒ کی زیارت کی جاتی، جن کا مزار کھیتوں سے ذرا دور آتی کوڑے کے پہاڑ پر واقع ہے۔ بعض کسان اور زمیندار اچھی فصل ہوتے پر بکرے کی نیاز کرتے اور اپنے قریبی لوگوں کو کھیت پر دعوت دیتے ۔ جب کھیت میں جوار کی راس ہوتی ہے تو بڑا لطف آتا ہے۔ رات رات بھر جاگ کر بیلوں کے ذریعہ جوار کے بُھٹّوں کو کُھندلوایا جاتا ہے اور یہ عمل دو، تین دن تک جاری رہتا ہے۔ ہر کھیت سے بیس تھیلوں سے

لے کر چالیس تھیلوں تک جوار نکلتی تھی۔ جوار کو علیٰحدہ کرکے کھلیان پر ہی اناج کے دو حصے کئے جاتے تھے۔ ایک حصہ کسان لے جاتا' دوسرا حصہ کھیتوں کا مالک یعنی زمیندار۔ سال بھر اپنے کھیتوں کی جوار استعمال کی جاتی ہے۔ اگر ضرورت سے زائد، تو بیچ دیا جاتی ہے۔ جوار کی کڑبی یا تو کھلیان پر ہی فروخت کی جاتی ہے یا کھیت کے کسی ایک کونے میں ڈھیر کی شکل میں رکھی جاتی ہے اور اس کو دھوپ یا بارش سے بچانے کے لئے مٹی کے ڈھیلوں سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ یہ کڑبی گائے' بھینس' بیلوں کے کھانے کے کام آتی ہے۔ گائے یا بھینس جب بچہ جنتی ہے تو تین' چار دن تک اس کا دودھ پڑوسیوں اور رشتہ داروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ دودھ بہت گاڑھا ہوتا ہے۔ اس دودھ میں گڑ ڈال کر گرم کیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ دودھ پیوسی میں بدل جاتا ہے۔ پیوسی بڑی لذیذ اور طاقت ور ہوتی ہے۔

پولیس ایکشن کے بعد جب یہ معلوم ہوا کہ بعض قولدار' قول پر لی ہوئی زمینوں پر قبضہ کرنے لگے ہیں تو ہمارے گھر والوں نے بھی قول دار سے جو کئی برسوں سے قول پر ہماری زمین پر کاشت کرتا تھا' زمین واپس لے لی اور میرے تایا زاد بھائی امیرالدین کے حوالے کی ۔ انھوں نے کافی محنت کی اور اچھی فصل اُگائی۔ اُن کے انتقال کے بعد ہم نے اپنی زمین اپنے ایک دوسرے رشتہ دار محمد حنیف کو قول پر دے دی' جو اپنی زمینات کے ساتھ ہماری زمین پر بھی کاشت کرتے ہیں۔

ایک روز میں اپنے دوستوں کے ساتھ کبڈی کھیل رہا تھا تو کسی نے مجھ سے کہا کہ محلہ تورخاں والے حملہ کی غرض سے ہمارے محلہ کی طرف آرہے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ میں فوراً جوش میں آگیا اور فوراً اپنے گھر کے ایک کمرہ کے کونے میں رکھی ہوئی بندوق اٹھالی اور اُس طرف بھاگنے لگا جہاں سارے محلہ کے لوگ جمع ہوگئے تھے۔ میری والدہ نے مجھے بہت روکا لیکن میں مشتعل ہوگیا تھا، رُک نہ سکا۔ میں بھاگتا ہوا محلہ میں واقع (کمان) دروازہ تک پہونچ گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ محلے کے بہت سے چھوٹے بڑے لوگ مختلف قسم کے ہتھیار لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے محلہ کے گروہ کی قیادت محمد صدیق' قمرالدین کے علاوہ عبدالقادر (میرے تایازاد بھائی) کررہے تھے۔ صدیق صاحب نے میرے جوش و ولولہ کو دیکھا تو کہا کہ میرے پاس کھڑے رہو' جب میں کہوں گولی چلادینا' ڈرنا نہیں۔ لیکن اُس وقت کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ اُس محلہ کے لوگوں نے اِدھر کا رُخ نہیں کیا۔ میں نے جب جوش میں آکر بندوق اُٹھائی تو مجھے اس بات کا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس بھرمار بندوق میں چھرّے ہیں کہ گولی ہے یا خالی ہے۔ ویسے بھی مجھے بندوق چلانا نہیں آتا تھا۔ بس ایک اندازہ قائم کر رکھا تھا۔ آج میں اپنی اُس حرکت کے بارے میں غور کرتا ہوں' تو سوچتا ہوں کہ بچپن میں انسان کن کن حالات کا شکار ہوجاتا ہے۔



پرندوں کا شکار

مجھے بچپن میں غلیل سے کبوتر، تیتر، بٹیر اور مختلف اقسام کے پرندوں کو مارنے کا شوق تھا۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ جنگل میں چلا جاتا اور جہاں کہیں کوئی پرندہ دکھائی دیتا اپنی غلیل کا نشانہ بناتا تھا۔

ایک دن میں نے ایک مرے ہوئے پرندہ کو درخت کی ایک ٹہنی پر باندھ دیا اور اس کو نشانہ بناتا رہا۔ دفعتاً میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ایک پرندہ کی بھی تو جان ہوتی ہے انسانوں کی طرح، اور پھر مرے ہوئے پرندوں پر نشانہ لگانا تو اور بھی انسانیت سوز حرکت ہے۔ یہ خیال جب اذیت رساں بن گیا تو میں نے غلیل پھینک دی اور پھر میں نے کبھی کسی پرندہ کا شکار نہیں کیا۔ میرا دل کچھ اس قدر گداز ہے کہ میں کسی بھی جاندار کو جب مرتا ہوا دیکھتا ہوں تو میرا دل کانپ جاتا ہے۔



ندیوں اور باولیوں میں تیرنا

مجھے بچپن میں ندیوں اور باولیوں میں تیرنے کا بہت شوق تھا۔ خاص طور پر موسم گرما میں، میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اونچی اونچی باولیوں میں

کود کر نہایا کرتا تھا۔ محلہ شیو پور کے کنارے میرے تایا کا ملا (تری کے کھیت) تھا۔ اس ملے میں ایک بڑی باؤلی تھی جس میں ہمیشہ پانی بھرا ہوا رہتا تھا۔ میں اکثر اس باؤلی میں تیرتا تھا۔ بہت اونچائی سے ایک خاص طریقہ سے کودنے پر باؤلی کا پانی اچھل کر باؤلی کے اوپر آجاتا تھا جس کی وجہ سے باؤلی کے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں پر پانی گرتا تھا۔ خوب پانی نہانے کے بعد میں اپنے تایا کے کھیت سے پیاز کے پودے اکھاڑ کر لاتا۔ موٹ کے پانی سے دھو دیتا، پیاز کو پودے سے الگ کر دیتا اور پیاز پر زور سے مکّا مار کر چھوڑ دیتا جس میں سے تلخ پانی نکل جاتا تھا اور میں جوار کی روٹی سے پیاز کھاتا تھا، جو بے حد مزہ دے جاتی تھی۔



بھیس بدلنا

عام لڑکوں کی طرح میں بھی بچپن میں بہت شریر تھا۔ ایک دن مجھے اور میرے دوستوں (علیم الدین، عبدالرحمٰن اور عبدالخالق) کو یہ شرارت سوجھی کہ کیوں نہ اپنے محلہ میں شام ڈھلتے ہی بھیس بدل کر بھیک مانگیں اُس زمانے میں بھیک مانگنے کا مطلب یہ تھا کہ روٹی مانگی جائے اس لئے کہ فقرا صبح و شام روٹی مانگتے تھے اور بعض گھروں سے روٹی کے لئے آٹا لے جاتے تھے۔ ہم نے جسم پر راکھ مل لی، چہرے پر راکھ اور مصنوعی داڑھی لگا لی، تہہ بند باندھا

ہاتھ میں کٹورا لیا اور بغل میں ایک جھولی ڈالی۔ بالکل گداگروں کی طرح ہم نے بھیس بدلا۔ سب سے پہلے اپنے گھر سے متصل جناب غلام نبی (ہمارے چچا صاحب) کے مکان پر میں نے آواز دی۔ "اماں فقیر کو روٹی ڈالو"۔ میری چچی آواز سُن کر دروازہ پر آئیں اور میری جھولی میں روٹی ڈال دی۔ دوسرا مکان میرے رشتہ کے ایک ماموں غلام رسول صاحب کا تھا' اس طرح میں نے کچھ اور گھر جاکر روٹیاں جمع کرلیں۔ صبح ہم نے یہ روٹیاں فقیروں اور غریبوں میں تقسیم کردیں۔



پتھروں کی بارش

میرے محلہ کے چند لڑکوں کو ایک انوکھی شرارت سوجھی۔ کچھ لڑکوں نے آدھی رات کے بعد محلہ کے گھروں پر پتھر برسانا شروع کیا۔ محلے والے پریشان ہوگئے' ایسا واقعہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ محلے والوں کو تجسس ہوا کہ آخر اس امر کا پتہ چلایا جائے کہ یہ شرارت کس کی ہے۔ ایک شب محلے کے کچھ لوگوں نے ایک گروپ بنایا اور یہ طے کیا کہ ساری رات جاگتے رہیں اور یہ پتہ لگائیں کہ پتھر کہاں سے آرہے ہیں؟ ایک گروہ محلے کے ہر گھر میں جاکر یہ جاننا چاہا کہ کوئی لڑکا گھر سے غائب تو نہیں ہے۔ ایک رات وہ شرارتی لڑکے پکڑے گئے (جن میں میں نہیں تھا)

انہیں صبح نماز فجر کے بعد محلہ کی مسجد میں پیش کیا گیا اور انہیں سزا دی گئی۔ ہمارے محلہ کا ایک رواج تھا کہ کوئی خاص مسئلہ ہو تو محلہ کی مسجد میں فجر کی نماز کے بعد اس خاص مسئلہ کے بارے میں غور کیا جاتا اور اس کی یکسوئی کی جاتی تھی۔



جے۔ رام جی کی مٹھائی

ہمنا باد کے بازار میں ایک مٹھائی فروش جے رام جی کی دوکان خوب چلتی تھی۔ خاص طور پر اس کی دوکان میں گلاب جامن، نہایت لذیذ بنتے تھے۔ کبھی کبھی ہم چند دوست تقریباً ۹ بجے شب مٹھائی کھانے کے لئے جے رام جی کی دوکان جاتے۔ دوکان میں بیٹھ کر گلاب جامن کھا لیتے۔ گلاب جامن، کھانے کے بعد کھارا (چوڑوا منگواتے)۔ جے رام جی رات کو بھنگ کھایا کرتے تھے۔ وہ دوکان کے کاروبار بھنگ کے نشہ ہی میں چلاتے تھے۔ نشہ میں انہیں یاد نہیں رہتا تھا کہ کس گاہک نے کیا کیا کھایا ہے۔ جب ہم مٹھائی کھانے کے بعد اٹھتے تو جے رام جی سے پوچھتے کہ "جے رام جی کتنے پیسے ہوئے" وہ فوراً جواب دیتے۔ اتنے ہی۔ جب ہم دوبارہ پوچھتے کتنے؟ تو کہتے کہ اتنے ہی اور وہ صرف کھارے (چوڑوے) کا حساب کر کے روپئے پیسے انہیں نشہ میں صرف آخری ایٹم یاد رہتا تھا۔ پتہ نہیں جے رام جی کو کس

لوگوں نے کس کس انداز سے دھوکہ دیا ہوگا۔ کبھی کبھی بچپن کی ایسی حرکتوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو بڑی ندامت ہوتی ہے۔



ہمناباد کا محرم

میرے بچپن میں ہمناباد کا محرم بڑی ہنگامہ خیزی کے ساتھ گذرتا تھا۔ پہلی محرم سے ۱۲ ویں محرم تک کافی مصروفیات رہتی تھیں۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہر رات مختلف محلوں میں علم دیکھنے کے لئے چلا جاتا تھا۔ ہمناباد میں کئی علم کی سواریاں بڑی دھوم دھام سے نکالی جاتی تھیں۔ محلہ نذیر پیٹ سے ۹ محرم کو حضرت امام قاسم اور گوگی صاحب کے علم اُٹھائے جاتے تھے۔ یہ علم نواب بندہ علی خان جاگیردار کی نگرانی میں بٹھائے جاتے اور انہیں کے اخراجات سے علم کی سواری کا انتظام کیا جاتا تھا۔ رات کے تقریباً ڈھائی بجے یہ علم نکلتے اور صبح صبح واپس ہوتے اور ٹھنڈے کئے جاتے۔ محرم کے اس جلوس میں بکثرت ہندو مسلمان نہایت عقیدت کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ یہ علم ہمناباد کے سب سے زیادہ مشہور علم ہیں جن کی سواریاں عقیدت و احترام کے ساتھ نکالی جاتی تھیں۔ جہاں سے یہ علم گذرتے اُن راستوں پر مکانوں اور دوکانوں میں لوگوں کی ایک کثیر تعداد ان کے دیکھنے کے لئے موجود رہتی تھی۔ (مرد، عورتیں، بچے، جوان، بوڑھے سبھی شریک ہوتے تھے)۔ ہمارے محلہ کفر توڑ سے بھی ایک

علم نعل صاحب ۱۰ محرم کی صبح ۱۰ بجے نکلتے ہیں۔ سینکڑوں افراد بلاتخصیص مذہب، ذات و فرقہ، سواری دیکھنے جوق در جوق آجاتے تھے۔ اس وقت لوگ ایک عجیب عالم میں ہوتے، جب علم پکڑنے والے شخص کو وجد آجاتا۔ وہ مخصوص شخص علم اُٹھانے سے ایک گھنٹہ پہلے آجاتا تھا اور لوگوں سے کافی فاصلے پر بیٹھا رہتا۔ جب علم اُٹھانے کا وقت قریب آجاتا تو وہ اچانک کھڑا ہوکر بغیر پلک جھپکائے علم کو گھورنے لگتا۔ تمام لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ علم اور اس کے درمیان راستہ بناتے۔ رفتہ رفتہ اس کے جسم میں رعشہ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی اور وہ بھاگتا ہوا علم پر گر جاتا۔ اس کے ساتھ ہی بگیاں، تاشے، نوبت، نقارے بجنا شروع ہو جاتے۔ مجاور، علم اُس کے حوالے کر دیتا۔ علم کی سواری مقررہ راستوں سے گذرتی۔ ایک اور علم کی سواری محرم کی ۱۲ ویں تاریخ کو محلہ شیو پور سے نکلتی تھی۔

محرم کی تیاریاں بقرعید کے بعد ہی سے شروع ہو جاتی تھیں۔ چھوٹی عمر کے بعض لڑکوں کو شیر ببر بنایا جاتا تھا۔ ملکھم نکالے جاتے، پہلوان اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ سواری کے سامنے لکڑیوں اور تلواروں کی کرتب بازی کا مظاہرہ ہوتا۔ ہر محلہ کے لوگ اپنی اپنی پارٹی کے ساتھ ایک گروپ کی شکل میں شریک ہوتے تھے۔

محرم میں بہت ہی دل سوز اور غمگین دھنوں میں عورتیں ماتم کرتی تھیں۔ ہمارے گھر جس کی شکل ایک باڑہ کی سی ہے کے کھلے آنگن میں محلہ کی خواتین حلقہ بنا کر رات رات بھر ماتم کرتی ہوئیں شہیدوں کا تذکرہ کرتی تھیں۔ یہ سلسلہ

رات کے ۱۰ بجے کے بعد شروع ہوتا اور صبح تک جاری رہتا۔



درگاہیں ، زیارتیں اور نیازیں

اُس زمانے میں بزرگانِ دین کی درگاہوں پر جانا ، ان کی زیارت کرنا اور ان سے منتیں مانگنے کا عام رواج تھا۔ ہنما آباد سے قریب کوئی چھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں گھوڑواڑی شریف کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں کے بزرگ حضرت اسمٰعیل شاہ قادری کی بڑی شہرت ہے۔ وہاں اب بھی ہر جمعرات کو سینکڑوں بکرے نیاز کے سلسلے میں ذبح کئے جاتے ہیں۔ مجھے بچپن میں صرف دو دفعہ گھوڑواڑی شریف جانے کا موقع ملا۔ روایت کے مطابق زیارت کیلئے درگاہ پر اُس وقت جا سکتے ہیں جب کہ زائرین درگاہ سے متصل تالاب میں نہانے سے فارغ ہو جائیں۔ زائرین کا عقیدہ ہے کہ اُسی تالاب کے پانی سے پکوان کیا جائے اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو پکوان میں سے کیڑے نکلتے ہیں۔



ہمناباد کی جاترائیں

ہمناباد کی شہری وہر یعنی مشہور مانک نگر کے مانک پربھو کی جاترائیں کافی مشہور ہیں، جن میں ہزاروں ہندو مسلمان شریک رہا کرتے ہیں۔ مانک پربھو کی جاترا مانک نگر میں ہوتی ہے جو ہمناباد سے بمشکل دو کیلومیٹر پر واقع ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہمنا باد کی جاترا اور مانک نگر کی جاترا دیکھنے کیلئے ہر سال پابندی سے جاتا تھا۔ شام میں دوکانوں اور میلوں میں گھومنے کے علاوہ میں رات بھر مندر میں بھجن سنا کرتا تھا۔ اُس زمانے میں دور دور سے مشہور گویے آتے تھے۔ ہندو مسلم نمائندہ شخصیتوں کے لئے فرش پر نشستوں کا انتظام کیا جاتا تھا۔ جاتراؤں میں ہندو مسلم سبھی شریک ہوتے تھے۔ یہ جاترائیں گنگا جمنی اور ایک تہذیبی جشن کا منظر پیش کرتی تھیں۔ مندر کا پجاری ہمیں بھی ناریل کے ٹکڑے کھانے کے لئے دیتا تھا اور ہم بڑے شوق سے ناریل کھاتے تھے۔ ان جاتراؤں میں ہر قسم کے سامان کی دوکانیں لگتی تھیں، کچھ ضروری چیزیں ہم بھی خریدتے تھے۔ ہمنا آباد کی جاترا میں مسالے کے لڈو خصوصیت کے ساتھ فروخت ہوتے تھے جو نہایت لذیذ ہوتے ہیں۔ جاتراؤں میں جب رتھ نکالا جاتا ہے تو وہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ عقیدت مند ہندو رات بھر جاگ کر رتھ میں شریک ہوتے ہیں۔ مسلمان بھی رتھ کے جلوس میں شریک ہوتے ہیں۔

پولیس ایکشن

۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو جب ریاست حیدرآباد پر پولیس ایکشن ہوا تو میں اُس وقت حیدرآباد میں تھا جس دن حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں کی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اُس وقت حیدرآباد میں ہر طرف بے حد سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ جو لوگ بھنابارد اور آس پاس کے علاقوں سے حیدرآباد آئے ہوئے تھے وہ بہت زیادہ پریشان تھے۔ اُس وقت ہم تک یہ خبریں پہنچ چکی تھیں کہ ملٹری، عثمان آباد کو روندتے ہوئے بھنا باد کو تباہ کر چکی ہے اور سڑکوں کے آس پاس جو بھی گاؤں ہیں وہاں قتل و خون، لوٹ مار کا بازار گرم ہو رہا ہے۔ یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ ہمارے خاندان کا ایک شخص بھی زندہ نہیں بچا۔ ایک ہفتہ کے بعد میرے ماموں عبدالحق صاحب کا ایک بھتیجا نعیم اُنہیں بھنا باد لے جانے کے لئے آیا، اُس نے اطلاع دی کہ بھنا باد میں سب کچھ ٹھیک ہے اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حفاظت کی ہے۔

پولیس ایکشن کے بعد جب راستے صاف ہو گئے اور امن قائم ہو گیا تو میں بھنا باد گیا۔ بھنا باد میں داخل ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ فوج نے ہر گھر کی تلاشی لی۔ جہاں کہیں ہتھیار ملے لے لئے۔ ہمارے محلے میں بھی ہتھیاروں کے ضبط کرنے کے سلسلے میں خانہ تلاشی ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ بھنا باد کے دو تاجر شری رام چندر کھتری اور مسٹر راچپا ہتی فوج کے ساتھ تھے جن کی وجہ سے نہ تو کوئی جانی

نقصان ہوا اور نہ مال و اسباب لوٹا گیا۔ میری والدہ نے مجھے بتایا کہ جب ملٹری ہمارے گھر ہتھیاروں کی تلاش کیلئے آئی تو اسے کوئی ہتھیار نہیں ملا۔ (کیونکہ ہمارے گھر میں کسی قسم کا بھی ہتھیار نہیں تھا) البتہ فوجیوں نے تجوری توڑنے کی کوشش کی مگر وہ تجوری توڑ نہ سکے (ویسے بھی تجوری میں کچھ زیورات کے سوا کچھ نقدی اور پیسے نہ تھے) جاتے ہوئے فوجی دیواری گھڑی اور ٹیپ ریکارڈر لے گئے۔ والدہ نے یہ بھی بتایا کہ پولیس ایکشن کے دوران ہمارے گھر میں محلہ ... اور محلہ حیدر خان کھاڑہ کے تقریباً ۵۰ - ۶۰ مرد خواتین اور بچے ایک ہفتہ تک ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب حالات بہتر ہو گئے تو وہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔ پولیس ایکشن کے دوران میری ایک رشتہ کی بھتیجی ... صاحب گھبرا کر ۴۰ گز گہری باؤلی میں کود گئی تھیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے بچ گئیں۔ ان ہی دنوں میرے چھوٹے بھائی محمد ضیاء اللہ کو شرپسند اور ملٹری کے جوان یہ کہہ کر گھر سے لے گئے کہ یہ رضاکار ہے لیکن میرے چچا غلام نبی جرأت و حوصلہ سے کام لیتے ہوئے اس کو چھڑا لے آئے یہ کہتے ہوئے کہ یہ ایک طالب علم ہے۔ اس ہنگامہ کے دوران میرے کچھ رشتہ دار گھبرا کر ... سے حیدرآباد جانے کے لئے اپنے اپنے گھروں سے نکل گئے تھے۔ راستے میں ایک گاؤں ... میں ٹھہر گئے۔ اس وقت یہ بات عام تھی کہ آس پاس کے شرپسند مسلمانوں پر حملہ کر رہے ہیں اور ان کے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ جس مقام پر میرے بھانجے مشہور شاعر علی الدین نوید کے والد، والدہ اور خاندان کے دیگر افراد ٹھہرے ہوئے تھے اس مکان کو غنڈوں

نے گھیر لیا اور مکان میں گھس کر علی الدین نوید کے والد محمد ریاض الدین کو ان کے دو چچا فیاض الدین (جانی) اور شجاع الدین، میرے ایک اور بھانجہ جمیل تنویر کے والد محمد قاسم کو قتل کر دیا۔ پولیس ایکشن میں ہمارے خاندان کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے۔ اگر یہ لوگ ہمنا باد میں رہتے تو شاید ان سے یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ یہ [illegible] نہایت شریف نفس شخص تھے۔ ان پر کوئی بھی شر پسند حملہ نہیں کر سکتا تھا۔

* میں نے ہمنا باد میں ہفتم جماعت کی تعلیم ختم کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے حیدرآباد آگیا۔ میری والدہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں مزید تعلیم حاصل کروں۔ والدہ کی یہ خواہش تھی کہ میں اپنے والد کی تجارت کو سنبھال لوں۔ اس زمانے میں ہمنا باد کے طلب ہفتم جماعت کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے حیدرآباد آتے تھے (چونکہ ہمنا باد میں صرف مڈل اسکول تھا)۔ والدہ کے اصرار پر ہفتم کامیاب کرنے کے بعد بھی میں ایک سال ہمنا باد میں ہی رہا۔ اس اثنا میں میں نے ہمنا باد کے ایک تعلیمی ادارے میں منشی کی تعلیم حاصل کی۔ منشی کی سند اس زمانے میں میٹرک کے مماثل تھی۔ میں نے اچھے نمبرات کے ساتھ منشی کا امتحان کامیاب کیا۔ منشی کامیاب کرنے کے بعد حیدرآباد کی طرف میری نظریں اٹھنے لگیں۔

مجھے حیدرآباد آنے کی ترغیب دینے میں میرے ایک قریبی رشتہ دار عبدالستار صاحب کی شخصی دلچسپی کا بڑا دخل رہا ہے۔ وہ میرے ساتھ منشی کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد حیدرآباد چلے گئے تھے اور وہاں انہیں محکمہ سیول سپلائز

میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت مل گئی تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ حیدرآباد میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ سرکاری ملازمت بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ہم سے پہلے تعلیم کی غرض سے حیدرآباد آنے والوں میں ــــــ محمد غوث محی الدین، عبدالواحد خاں اور عبدالمنان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ عبدالمنان صاحب نے پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد آنے والے اپنے رشتہ داروں کی غیر معمولی مدد کی۔ کئی مہینوں تک ان کے رشتہ دار ان کے مکان واقع دبیرپورہ میں رہے۔ عبدالمنان صاحب میرے قریبی رشتہ دار ہیں، جو اپنی اعلیٰ انسانی ہمدردی کی وجہ سے سارے خاندان میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ جناب غوث محی الدین میرے حقیقی بہنوئی اور جناب عبدالواحد خاں میرے ماموں زاد بہنوئی ہیں۔ ان دونوں نے حیدرآباد میں میری طالب علمی کے زمانے میں ہر لحاظ سے خیال رکھا۔ میں ان ہی کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ پہلے یہ دونوں گھانسی بازار میں ایک کرایہ کے مکان میں تنہا رہا کرتے تھے، بعد میں دونوں اپنی فیملی کو لے آئے۔ میری بہنیں حوران بانو اور بی جانی بانو میرے ہر قسم کے آرام کا خیال رکھتی تھیں۔ میرے بچپن میں جو لوگ اپنے دور کی پہچان بن چکے تھے ان میں شیرالزماں، فقیر بیگ، چاند پاشاہ وکیل، ڈاکٹر محمد ابراہیم، محمد شفیع مسعود، اکرم جرم، غلام رسول، عشرت علی، قمرالدین، محمد مصطفےٰ، عبدالرشید، حکیم محمد محسن، امیرالدین، عبدالقادر، اسمٰعیل، محمود صدیقی قابل ذکر ہیں۔

عبدالستار صاحب کی شخصی دلچسپی سے میں بھی محکمہ سیول سپلائز میں بحیثیت کلرک ملازم ہوگیا۔ کلریکل پوسٹ کے لئے منشی یا میٹرک کامیاب

کرنا ضروری تھا۔ علی گڑھ میٹرک کی تعلیم کے لئے میں نے پیراڈائز
انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیا۔ اس انسٹی ٹیوٹ سے طلبا کو ہر سال امتحان کے لیئے
علی گڑھ لے جانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اُس وقت کے اساتذہ میں ڈاکٹر عبدالرزاق
فاروقی سابق صدر شعبۂ اُردو گلبرگہ یونیورسٹی، بھی تھے۔ میں نے اس انسٹی ٹیوٹ کے
ذریعہ علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں میٹرک کا امتحان درجہ دوم میں کامیاب
کیا۔ ممتاز شاعر تخلص محسن خیال بھی اُسی گروپ میں شامل تھے جو امتحان دینے
کے لئے علی گڑھ جا رہے تھے۔ جب میں نے علی گڑھ میٹرک امتحان کا ارادہ
کر لیا تو اپنے چھوٹے بھائی محمد ضیاء الدین اور اپنے رشتہ کے بھتیجے مجیب الدین
کو بھی امتحان میں شرکت کی ترغیب دی۔ ان دونوں نے بھی باقاعدہ میرزا قمر بیگ
سے علی گڑھ میٹرک کی تعلیم حاصل کی اور میرے ہمراہ علی گڑھ آئے۔ ان دونوں
نے بھی میرے ساتھ ہی کامیابی حاصل کی۔ اس دوران میں میں نے جامعہ
نظامیہ حیدرآباد سے اچھی پوزیشن کے ساتھ منشی فاضل کا امتحان کامیاب
کیا۔ میں پہلے ادارۂ شرقیہ میں زیر تعلیم رہا، جہاں میرے قابل اساتذہ میں مولانا
حمید الدین قمر اور علامہ تلمیذ احسن تھے۔ پھر میں نے غلام احمد یکتا سے
ادارۂ اشاعت العلوم میں منشی فاضل کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا کلیمی کی سرپرستی
نے ہم طلبا کو شعر گوئی اور شعر فہمی کی تعلیم دی۔ اس زمانے میں طلبا کو اُردو
اور فارسی کے اچھے اچھے اشعار یاد کرائے جاتے تھے۔ ادارۂ ادبیات اُردو
حیدرآباد سے میں نے اُردو عالم اور اُردو فاضل کے امتحانات درجہ اول میں کامیاب
کئے۔ اُردو فاضل کی بنیاد پر جامعہ اُردو علی گڑھ کا امتحان ادیب کامل بدرجۂ اول

کامیاب کیا (امتحان کا سنٹر حیدرآباد تھا)۔ میں نے ان تمام امتحانات کی تیاری اپنے طور پر کی تھی (کسی انسٹی ٹیوٹ میں شرکت نہیں کی)۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد میں نے جمعیہ پنجاب انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا جس کے لئے مجھے بھوپال کے علاوہ اجمیر شریف بھی جانا پڑا۔



علی گڑھ میٹرک کا امتحان

علی گڑھ میٹرک کے امتحان کے سلسلے میں مجھے تقریباً ۲ ہفتے علی گڑھ میں رہنا پڑا۔ ہمارے انسٹی ٹیوٹ کے تقریباً ۳۰-۳۵ طلباء علی گڑھ یونیورسٹی کیمپس کے بالکل قریب شمشاد بلڈنگ میں مقیم رہے۔ فیض الحسن خیال صاحب سے میری پہلی ملاقات علی گڑھ جاتے ہوئے ٹرین میں ہوئی۔ دوران سفر فیض الحسن خیال نے مجھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "دوست آیئے تعلیمی تاش کھیلیں۔ پھر خیال نے فلمی گانے گانا شروع کیے۔ ان کے قریبی دوستوں میں نواب جنید اللہ خاں اور افسر نواب (فرزند نواب دوست محمد خاں) تھے۔ میری بھی ان لوگوں سے دوستی ہو گئی۔ نواب جنید اللہ خاں کے ساتھ ایک اور طالب علم جو ہم سے بڑی عمر کا تھا، نواب جنید اللہ خاں کی سرپرستی میں امتحان دینے کے لئے آیا تھا (جو ایک نامعقول اور احسان فراموش قسم کا آدمی تھا) وہ نواب جنید اللہ خاں سے سرد مہری کا برتاؤ کرتا تھا۔ ایک دن میں

سے اور فیض الحسن خیالؔ نے شرارتاً اُس کو مشورہ دیا کہ اس بلڈنگ کے سامنے درخت کے نیچے سکون سے امتحان کی تیاری کی جاسکتی ہے۔ وہ تیار ہو گیا۔ جیسے ہی وہ کرسی پر اونگھنے لگا میں نے اور خیالؔ نے اُس کو کرسی سے باندھ دیا اور اُس وقت تک نہیں کھولا جب تک کہ اُس نے جنید اللہ خاں سے معافی نہیں مانگی۔ شمشاد بلڈنگ سے کچھ فاصلے پر کچھ ہوٹلیں تھیں جہاں عموماً علی گڑھ یونیورسٹی کے ہاسٹل کے طلباء شام میں چائے پینے کے لئے آتے تھے۔ روایت ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء اُن دنوں اُن حیدرآبادی طلباء پر جملے کستے تھے جو امتحان دینے کے لئے علی گڑھ آتے تھے۔ ہمارا گروپ بھی اسی ہوٹل میں چائے پینے کے لئے جاتا تھا جس ہوٹل میں علی گڑھ ہاسٹل کے طلباء بیٹھتے تھے۔ ایک شام علی گڑھ کے طلباء نے ہم حیدرآبادیوں پر جملے چست کرنا شروع کئے۔ جواباً ہم نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ ایک دفعہ بُری طرح اُلجھنے کی نوبت آئی لیکن الجھاؤ سے پہلے مرحلہ پر ہی وہ لوگ کے خاموش ہو گئے (چونکہ ہم طلباء کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی)۔ میں، فیض الحسن خیالؔ اور بشمبر دیال اپنے گروپ کی نمائندگی کرتے تھے۔ پھر اُن طلباء نے ہم سے دوستی کرلی۔ امتحانات کے درمیانی دنوں میں ہمارا سارا گروپ تاج محل، آگرہ اور دلّی دیکھنے کے لئے گیا تھا۔

علی گڑھ میٹرک کے امتحان کے زمانے میں بعض حیدرآبادی طلباء، طوائفوں کا گانا سُننے کے لئے آبادی میں جاتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ وہی طالب علم جو نواب جنید اللہ خاں کے ساتھ آیا تھا، ایک طوائف کے پاس گانا

ننے کے لئے گیا، معلوم ہوا کہ اُس طوائف کی نگران کسی خاتون نے اُس کے
ڈ کپڑے اُتار لئے۔ (چونکہ اس طالب علم کے پاس گانا سُننے کے لئے پیسے نہ
ے)۔ علی گڑھ سے واپسی کے بعد فیض الحسن خیالؔ سے میری دوستی پروان چڑھی
۔ منشی فاضل (پرشین گریجویٹ) کامیاب کرنے کے بعد میں نے لا کلاس میں
خلہ لیا۔ وکالت کا یہ کورس دو سال کا ہوتا تھا۔ کچھ مہینوں کے بعد میں وکالت
تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ اُن دنوں میں راشننگ ڈپارٹمنٹ (محکمۂ سیول سپلائز)
ں بحیثیت کلرک ملازم ہوگیا تھا۔ میں شہر میں گوشہ محل، مغل پورہ اور ملک پیٹ
ے دفاتر میں کام کرتا رہا۔ پھر کچھ مہینوں کے لئے میرا تبادلہ کتہ گوڈم (کھمم)
ر ہو گیا۔



اُجالوں کا سفر

میری بیوی رحمت النساء بیگم بقول میری والدہ کے، مجھ سے اُس وقت
سوب ہوئی جب وہ صرف ۴۰ دن کی تھی۔ میری بیوی میرے ماموں الحاج
حبیب الدین کی تیسری بیٹی ہے۔ میری شادی اُس وقت ہوئی جب میری عمر
۱۸ سال کی ہوگی۔ میری بیوی نے وسطانیہ تک تعلیم پائی ہے (چونکہ
آباد میں فوقانیہ درجہ کی تعلیم کی سہولت نہ تھی)۔ گھر کا ماحول مذہبی اور
اتی اور دینی تھا، اِس لئے مذہبی اور اخلاقی تعلیم پر زیادہ توجہ دی گئی۔ میری

بیوی پابند صوم و صلوٰۃ ہے۔ برسوں سے تلاوت کلام پاک کے مقدس اور محبوب مشغلہ میں مصروف ہے۔ انہیں میری شعر و شاعری اور ادبی سرگرمیوں سے نہ تو کوئی سروکار ہے اور نہ ہی کوئی دلچسپی۔ مزاجاً وہ فنونِ لطیفہ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں۔ میرے شاعرانہ مزاج، میری علمی و ادبی مصروفیات سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، البتہ کوئی تمغہ اعزاز مل جائے تو قدرے خوش ہو جاتی ہیں لیکن خوشی کا اظہار قطعی نہیں کرتیں۔ دراصل انہوں نے بچوں کی دیکھ بھال، گھر کے کام کاج کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ مشاعروں، ادبی محفلوں میں شرکت کا بالکل شوق نہیں ہے۔ فنونِ لطیفہ کے کسی شعبہ سے بھی دلچسپی نہیں ہے۔ مہمان نوازی میں لاثانی ہے۔ میرے گھر مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اُن کی موجودگی سے میری بیوی کی پیشانی پہ بل تک نہیں پڑتے۔ شہر میں میری بہت سی منہ بولی بہنیں ہیں، شاعرات ہیں، خواتین شاگرد ہیں، جو کبھی کبھی میرے گھر آجاتی ہیں تو اُن کی تواضع میں کوئی کمی نہیں کرتیں۔

شادی سے پہلے میں نے اپنی بیوی کی صرف ایک جھلک اُس وقت دیکھی تھی جب وہ اپنے گھر کے آنگن میں کھڑی ہوئی تھیں۔ شاید اُن کی عمر اُس وقت ۹، ۱۰ برس کی ہوگی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ شرما کر بھاگ گئی تھیں۔ (چونکہ وہ بچپن ہی میں مجھ سے منسوب ہو چکی تھیں) ہماری منگنی نہیں ہوئی۔ بزرگوں نے جو کچھ آپس میں گفتگو کی وہی سب کچھ ازدواجی رشتہ کا سنگِ میل تھا۔ میری شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ شادی کے وقت میری بیوی کی عمر ۱۴ سال کی تھی۔

میرے بقید حیات اس وقت ۴ لڑکے اور ۳ لڑکیاں ہیں ۔ میرا پہلا لڑکا نجیب ۲ سال کی عمر میں انتقال کرگیا، جس کا صدمہ مجھے کئی مہینوں تک رہا۔ اب بھی جب وہ مجھے یاد آتا ہے تو اُس کی معصوم صورت میری نگاہوں میں پھرنے لگتی ہے اور مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہے ۔ اس کی صرف دو باتیں میرے دل و دماغ میں پیوست ہو کر رہ گئی ہیں ۔ حیدرآباد میں، میں اپنی بڑی بہن کے ساتھ محلہ بھیری الاوہ (گھانسی بازار) میں رہتا تھا ۔ میرے طالب علمی کا زمانہ بھی وہیں گذرا ۔ میری شادی کے بعد میری بیوی اُسی گھر میں رہی ۔ ایک دن کی بات ہے کہ میرے لڑکے نجیب کا سیدھا ہاتھ مونڈھے سے سرک گیا۔ جراح بیگم بازار میں رہتا تھا ۔ ایک شام جب میں اُس کو گود میں لے کر سٹی کالج گراونڈ سے پیدل گذر رہا تھا تو اُس نے مجھ سے چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا تھا ۔ وہ لطیف احساس آج بھی میری شخصیت کو ہلاکر رکھ دیتا ہے ۔ اُس نے اشارتاً یہ کہا تھا کہ ہاتھ میں درد ہورہا ہے ۔ نہایت خوبصورت، گلاب تازہ کی طرح صحت مند بچہ تھا ۔ یاد نہیں ہے کہ کس بیماری سے اس کا انتقال ہوگیا ۔ نجیب کا انتقال ہمناباد میں ہوا ۔ جب وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا تو میں نے خدا سے اُس کی حیات کے لئے گڑگڑا کر دعا مانگی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اے پروردگار اُس کی زندگی کے بدلے میری جان لے لے لیکن میری دعا قبول نہیں ہوئی ۔ میری ازدواجی زندگی کا یہ پہلا اور اذیت ناک صدمہ ہے ۔ میں کئی دنوں تک سنبھل نہ سکا ۔ (پہلی اولاد کا صدمہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے)۔ اس کے بعد طلعت سلطانہ پیدا ہوئی ۔

میرے ۳ لڑکوں میں شمس الدین عارف میرا پہلا لڑکا ہے، جس نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم۔ایس سی کا امتحان درجۂ اول میں کامیاب کیا۔ گذشتہ ۸ سال سے دوحہ، قطر کی ایک پرائیوٹ کمپنی میں منیجر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ عارف بے حد ذہین لڑکا ہے۔ جب وہ سٹی کالج میں زیر تعلیم تھا تو اُس نے ایک سالانہ جلسہ میں کئی انعام حاصل کئے تھے۔ انعام میں ۱۷ کتابیں بھی ملی تھیں۔ (جو اب تک محفوظ ہیں)۔ اس کے سٹی کالج کے شفیق اساتذہ میں جناب ضیاء الحسن جعفری اور ڈاکٹر اکمر علی بیگ ہیں۔ عارف نے سٹی ہائی اسکول لاڈ بازار سے اُردو ذریعۂ تعلیم سے میٹرک کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا۔ (اُس وقت جناب خواجہ معین الدین صدر مدرس تھے) اُس نے انگریزی ذریعہ تعلیم سے ممتاز کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجۂ اول میں کامیاب کیا۔ اس کالج کے پرنسپل محی الدین صاحب تھے۔ وائس پرنسپل محمد عبدالعزیز صاحب (جو عارف کے استاد بھی تھے)۔ اُردو کی ممتاز شاعرہ شفیق فاطمہ شعریٰ بھی عارف کی لکچرر رہ چکی ہیں۔ عارف نے نظام کالج سے بی۔ایس سی، درجۂ اول میں پاس کیا۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ، عارف کی لکچرر تھیں۔ دو سال پہلے ایک گریجویٹ، باسلیقہ، مشرقی ماحول میں پرورش پائی ہوئی، اطاعت گزار، سلیقہ مند مشرقی اقدار کی پاسدار، پابند صوم و صلوٰۃ لڑکی اطہر سلطانہ ذاکر کے والد مشتاق احمد صاحب محکمہ ایل۔آئی سی [illegible] عارف کی شادی ہوگئی۔ عارف کی شادی بغیر گھوڑے جوڑے کی رقم کے ہوئی۔ یہ شادی حیدرآباد کی مثالی شادی تھی جس میں شہر کی سیاسی غیر سیاسی شخصیتیں، ممتاز شہری، صنعت کار، اعلیٰ عہدہ دار، ممتاز صحافی، شاعر

و ادیب، پروفیسرز، ڈاکٹرز، انجینئرز اور عزیز و اقارب کی کثیر تعداد نے شرکت کی تھی۔ عارف کی ایک لڑکی ہے عظمیٰ عارف، جس کے خدوخال سے عیاں ہے کہ روشن مستقبل اس کی آنکھوں کی چمک کی طرح اُجالوں کا سفر طے کرے گا۔ اور وہ تمام عمر تازہ گلاب کی طرح مہکتی رہے گی۔ دوسری بیٹی بصیرت نور افشاں صبح کی پہلی کرن کی طرح سارے گھر میں نور برسا رہی ہے۔

سراج الدین سلیم میرا دوسرا لڑکا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ ایس سی کامیاب کرنے کے بعد اُس نے لینڈ سروئینگ، کنسٹرکشن اور ڈرافٹسمن سیول کا ڈپلوما حاصل کیا۔ چند دن اس ٹکنیکل شعبے سے وابستہ ہوگیا، لیکن بعد میں ٹرانسپورٹ کے ذاتی کاروبار شروع کر دیا ہے۔ الحمد اللہ وہ اپنے کاروبار میں کامیاب ہے۔

سراج الدین سلیم نے سٹی ہائی اسکول لاڈ بازار سے میٹرک کامیاب کرنے کے بعد ممتاز کالج سے انٹرمیڈیٹ اور انوار العلوم کالج سے بی۔ ایس سی کا امتحان کامیاب کیا۔ سراج الدین سلیم کی شادی اُس کے ماموں کی لڑکی نصرت سلطانہ سے ہوئی۔ اس کی بیوی بھی سنجیدہ، سلیقہ شعار، سعادت مند، مہمان نواز، اور مشرقی تہذیب کی پروردہ ہے۔ میٹرک کامیاب ہے۔ گھریلو کام کاج کے علاوہ اسے مذہبی اور ادبی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ یہ دونوں اپنی ازدواجی زندگی سے خوش ہیں۔ ان کے ایک بیٹی ہے، نجم السحر ذی شان، نہایت خوبصورت پیاری پیاری، جس کی ذہانت اور اندازِ گفتگو سارے خاندان کے لئے ایک سرمایۂ فرحت ہے۔

منہاج الدین خسرو میرا تیسرا بیٹا ہے۔ اس کی تعلیم ہائی اسکول سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کا رجحان ابتداء ہی سے ٹکنیکل فیلڈ میں قدم جمائے رکھنے کا تھا۔

چنانچہ اُس نے ویلڈنگ اور گریلنگ کے کاموں سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد گلستاں کے نام سے محلہ بہادر پورہ میں ایک ورکشاپ کھول رکھا ہے۔ اسے بڑے بڑے آرڈرس ملتے ہیں۔ وہ اپنے کام میں خوش ہے اور آہستہ آہستہ اپنے مالیہ کو مستحکم کرتا جارہا ہے۔ اس کی عمر ۲۵ سال ہے۔ کچھ دن پہلے اس کی شادی میرے ہی قرابت داروں کی ایک میٹرک کامیاب لڑکی رئیسہ بنت عبدالغنی سے ہوئی جو نہایت سلیقہ مند، نرم طبیعت، ملنسار، تہذیبی ماحول کی تربیت یافتہ ہے جس کے قدموں نے بھی ہمارے گھر کی رونق بڑھادی۔ نعیم الدین پرویز میرا چھوٹا لڑکا ہے، جس نے سٹی ہائی اسکول لارڈ بازار سے میٹرک پاس کیا۔ ممتاز کالج سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد گلبرگہ میں ایچ۔کے۔سائی کالج میں بی۔فارمیسی میں داخلہ لیا۔ دورانِ تعلیم اُس کے ذہن میں ایک چونکا دینے والا پروجیکٹ پرورش پانے لگا اور اُس نے طے کیا کہ دورانِ تعلیم ادویات کی تیاری کے لئے پودوں کا عرق نکالا جائے چنانچہ گذشتہ دو سال سے ہمناباد [illegible] زمین ایکڑ پر لے کر پودے اُگا رہا ہے اور دوائیوں کیلئے متعلقہ کمپنیوں کو [illegible] سپلائی کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہے اس کی عمر ۲۴ سال کی ہے۔ کچھ بننے کی دھن میں وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے۔

طلعت سلطانہ میری بڑی لڑکی ہے۔ اُس نے جماعت ہفتم تک تعلیم پائی تھی کہ ہم نے اس کی شادی کر دی۔ میرا داماد محمد عبدالفہیم (میرے چچا زاد بھائی عبدالکریم کا بڑا لڑکا ہے) نہایت سلجھا ہوا، نہایت سنجیدہ، متین، ذہین، محنتی، ایماندار ہونے کے علاوہ باسلیقہ تاجر پیشہ ہے۔ ٹرانسپورٹ کے کاروبار کیا کرتا ہے۔ اس کی زندگی مطمئن اور باسلیقہ ہے۔ طلعت سلطانہ کے ۴ لڑکے اور ۳ لڑکیاں

ہیں۔ لڑکوں میں وصی الدین شمیم، لئیق الدین تسیم، معین الدین وسیم اور شفیق الدین عظیم ہیں۔ اور لڑکیوں میں انجم کہکشاں، شبنم گلفشاں اور نیلم زرفشاں تمام بچے دینی اور اخلاقی ماحول میں زیر تربیت ہیں، معیاری اسکول میں تعلیم پا رہے ہیں۔

طلعت سلطانہ ایک قبیلہ پرور، محبت شناس اور معصروں کے دکھ درد میں شریک ہونے والی لڑکی ہے۔ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں خاصہ وقت صرف کرتی ہے۔ خاندان کے لوگوں میں اس کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ وہ سب کے ساتھ شیر و شکر کی طرح رہتی ہے۔ میری دوسری لڑکی عشرت عرفانہ میٹرک کامیاب ہے۔ میں نے اپنے حقیقی بھائی محمد ضیاء الدین کے لڑکے رفیع الدین جمیل سے اس کی شادی کر دی ہے۔ رفیع الدین ٹرانسپورٹ کے کاروبار کرتا ہے۔ ان دونوں کی ازدواجی زندگی خوشگوار ہے۔ عشرت کے چار لڑکے ہیں، مصباح الدین سہیل، مفتاح الدین فقیل، فلاح الدین فضل اور راحیل۔ عشرت عرفانہ سنجیدہ، بُردبار، سلیقہ مند، خوش مزاج، چھوٹوں کا لحاظ اور بڑوں کی عزت و احترام کرنے والی لڑکی ہے۔ اس کی ملنساری، عزیزوں اور رشتہ داروں میں مثالی ہے۔ زینت نسرین میری تیسری بیٹی ہے، میٹرک تک تعلیم پا چکی ہے۔ اخلاقی، دینی و ادبی کتابوں کے مطالعہ کا شوق ہے مشرقی ماحول کی دلدادہ ہے۔ گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ میرے ادبی کاموں میں بھی مدد کیا کرتی ہے۔

خُدا کا شکر ہے کہ میرے گھر کی فضاء ابتداء ہی سے خوشگوار رہی۔

میرے تمام لڑکوں میں آپس میں پیار، محبت و اتحاد ہے، اور ایک سلجھے ہوئے خاندان کی طرح ایک دوسرے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ ہم سب ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ ماں باپ کی عزت و احترام میں ان لڑکوں نے کوئی کمی نہیں کی۔ ان کا طرزِ عمل اور رکھ رکھاؤ خاندانی مثبت اقدار کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔

حسنِ اتفاق سے میرے تینوں لڑکوں شمس الدین عارف، سراج الدین سلیم منہاج الدین حسرت کی بیگمات بھی گھر کے خوشگوار ماحول اور خوش آہنگ تقدس کو برقرار رکھنے میں اہم حصہ ادا کر رہی ہیں۔



ڈائرکٹریٹ اور سکریٹریٹ کی ملازمت

میں ابھی طالب علم ہی تھا کہ میرا تقرر بحیثیت کلرک محکمۂ سیول سپلائز میں ہوا۔ ابتداء میں گوشت محل، مغل پورہ اور خلک پیٹ کے راشننگ دفاتر میں کام کرتا رہا۔ پھر میرا تبادلہ کچھ مہینوں کے لئے کتہ گوڑم (کھمم) پر ہوگیا۔

جب محکمۂ سیول سپلائز میں تخفیف عمل میں آئی تو میں بھی تخفیف کی زد میں آگیا لیکن جلد ہی میرا انجذاب اُسی خدمت پر ڈائرکٹر کمیونٹی پراجکٹ میں ۱ مئی ۱۹۵۵ء کو ہوا۔ یہ دفتر لیک ویوگیسٹ ہاؤز سے متصل عمارت سیول سروس ہاؤز میں تھا۔ جناب گرو سوامی ڈائرکٹر تھے۔ آفس سپرنٹنڈنٹ محمد عمر خاں اور جناب سعید تھے۔ اُس وقت کے میرے ساتھیوں میں عبدالرحیم، منجیت سنگھ ملک، خواجہ معین الدین، علیم الدین، افضل حسین، خواجہ بہاء الدین، کشتیا کرآئی، جی پربھاکر راؤ، محمود علی، ارجن راؤ، شانتی کمار ماتھر، نرسمہا ریڈی اور علی نواز خاں، محمد غوری قابل ذکر ہیں۔

جب فضل علی کمیشن کی رپورٹ کی روشنی میں لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تقسیم جدید عمل میں آئی تو میرا الاٹمنٹ پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ ڈپارٹمنٹ (سکریٹریٹ) میں ہوا۔ میرا محکمہ ڈائرکٹوریٹ کمیونٹی پروجکٹ، یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو پلاننگ ڈپارٹمنٹ (سکریٹریٹ) میں ضم ہوگیا۔ سکریٹریٹ جانے کے بعد مجھے ترقی ہوئی، اور ۱۶ جنوری ۱۹۵۷ء کو میں اپر ڈیویژنل کلرک (یو۔ ڈی۔ سی) بنا دیا گیا۔ پھر ۱۵ مارچ ۱۹۶۳ء میں مجھے سکشن آفیسر (گزیٹیڈ) کی حیثیت سے ترقی مل گئی۔ علی گڈھ میٹرک سے انٹر

کے وقت تاریخ پیدائش، اندازاً لکھوانے کی وجہ سے مجھے اپنی صحیح عمر سے پہلے وظیفہ حسن خدمت ہوگیا۔ اس کے فوری بعد میں روزنامہ سیاست سے وابستہ ہوگیا۔

ریاستوں کی تقسیم جدید کے بعد جب آندھرا اور تلنگانہ کے ملازمین ایک ہی سروس لسٹ میں آگئے تو آندھرا کے ملازمین کو احساس برتری پیدا ہوگیا۔ سکریٹریٹ کے ہر محکمہ میں آندھرا کے ملازمین کی تعداد تلنگانہ کے ملازمین کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ آندھرا کے عہدہ داروں اور اسٹاف کو یہ غلط فہمی تھی کہ حیدرآباد کے ہندو ہوں کہ مسلمان ملازم، ان کے مزاج میں نوابیت چھائی ہوتی ہے اور تلنگانہ کے ملازمین دفتری کام سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہیں، اُس وقت حالات کچھ ایسے ہوگئے تھے کہ تلنگانہ کے ملازمین احساس کمتری میں مبتلا ہوگئے تھے (اُن کے ساتھ ناانصافیوں کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا) آندھرا کے ملازمین کو ترقی کے زیادہ مواقع فراہم کئے جارہے تھے۔ جب آندھرا اور تلنگانہ کے ملازمین کی مشترکہ سینارٹی لسٹ تیار ہوئی تو بعض تلنگانہ ملازمین کی سینارٹی متاثر کردی گئی۔ یہ ساری بددیانتی ابتدائی مرحلوں میں (سکشن آفیسر اور اسسٹنٹ سکریٹری کی سطح پر) ہوتی تھی۔ اُن دنوں سکریٹریٹ کے اہم عہدوں پر آندھرا کے عہدہ داروں کو مقرر کیا جاتا تھا، جس کی وجہ سے تلنگانہ ملازمین کو بڑی طرح نقصان پہونچا۔ جب حق تلفی اور ناانصافی بڑھنے لگی تو ملازمین کی مختلف سطح کی انجمنیں حرکت میں آگئیں۔ تلنگانہ کی سروس اسوسی ایشن علحدہ کام کرنے لگی۔ آندھرا کے عہدہ داروں نے ہزاروں تلنگانہ ملازمین کو نقصان پہونچایا، وظیفہ پانے تک بھی وہ ناانصافی کا شکار رہے۔

جب ڈائرکٹریٹ کموتی پروجکٹ کے ملازمین، پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ ڈپارٹمنٹ

(ڈسکریٹریٹ) میں ضم کئے گئے تو اُس وقت سکریٹری پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ مسٹر نرسمھم تھے۔ اُنہوں نے ڈائرکٹوریٹ پروجکٹ کے ملازمین (ایل ڈی سی، یوڈی سی، سکشن آفیسرس، ٹائپسٹ اور اسٹینوز) کو اپنے اجلاس پر بلوایا۔ ہم تمام ان کے روم میں داخل ہوئے۔ انھوں نے ایک اُچٹتی سی نظر ہم پر ڈالی اور قدرے برہم ہوکر کہا کہ سکریٹری کے اجلاس پر آتے ہی تمہیں اپنا تعارف کرانا چاہیئے (دراصل وہ اپنے اس رویے سے ہم تلنگانہ ملازمین کو مرعوب کرنا چاہتے تھے) ہم یکے بعد دیگرے اپنا تعارف کرانے کے بعد اپنے اپنے سکشن میں چلے گئے۔ سکریٹری کے اس اہانت آمیز رویے نے ہم ملازمین کی عزتِ نفس کو دھکّا پہونچایا تھا۔ اُس وقت صیغۂ انتظامی (او۔پی) کا اسسٹنٹ سکریٹری لکشمی نارائن تھا جو نہایت مغرور انسان تھا۔ اُس کا رویہ محکمہ کے تمام ملازمین کے ساتھ نامناسب رہا کرتا تھا۔ اگر وہ کسی ملازم کو اپنے روم سے باہر کہیں دیکھتا تو بُری طرح ڈانٹتا تھا۔

ایک دن یوں ہوا کہ میں اپنے دوست افضل حسین (ٹائپسٹ) کے پاس چلا گیا تھا (جن کا سکشن میرے سکشن سے متصل تھا) لکشمی نارائن راؤنڈ پر نکلا تھا۔ جیسے ہی مجھے افضل حسین کے پاس کھڑا ہوا دیکھا تو اونچی آواز میں مجھ سے وہاں آنے کی وجہ پوچھنے لگا۔ میں نے اُسی لہجہ میں جواب دیا۔ وہاں سے وہ خاموشی اپنے روم میں چلا گیا اور فوراً مجھے چپراسی کے ذریعہ بلوایا اور کہا کہ میں آپ کے خلاف ایکشن لے سکتا ہوں۔ میں نے کہا آپ کچھ نہیں کرسکتے۔ وہ غصہ پی کر رہ گیا لیکن اُس نے اپنی بدفطرتی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک موقع پر میری سینیاریٹی کو متاثر کیا۔

میری ملازمت کی تقریباً تمام مدت اکاؤنٹس سکشن میں گذری۔ شروع شروع میں آندھرا کے بعض سکشن آفیسروں نے مجھ سے تحکمانہ انداز سے کام لینا چاہا لیکن میں نے اُنہیں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے نہیں دیا اور میں نے کسی مقام پر بھی اپنی شخصیت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا رہا۔

میں تقریباً ۱۸ سال تک اسسٹنٹ سکشن آفیسر رہا۔ اس دوران آندھرا کے بعض شریف النفس سکشن افسروں کے تحت کام کرنے کا بھی اتفاق ہوا جن میں قابل ذکر مسٹر بی۔ راما جوگا راؤ، کا مشور راؤ، حاجی قاسم، شیخ محبوب، اور ایم۔ وی نرسمہا راؤ ہیں۔ سکریٹریٹ میں میری پہلی پوسٹنگ صیغۂ انتظامی (اول) میں ہوئی۔ مسٹر سی۔ جے راما جوگاراؤ سکشن آفیسر تھے اور مسٹر آر۔ نرسمہا راؤ اسسٹنٹ سکشن آفیسر۔ یہ دونوں بہترین خصلت کے انسان تھے۔ میں ان کے ساتھ نہایت خوشگوار ماحول میں کام کرتا رہا۔ اُن دنوں رائے گنج بہاری لال میرے محکمہ میں ڈپٹی سکریٹری کی حیثیت سے آئے تھے۔ وہ ایک شفیق، مروت شناس، اور نفیس آفیسر تھے۔ اُن کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ شعر و ادب سے بے حد دلچسپی رکھتے ہیں اور کلکٹر کی حیثیت سے وہ جس ضلع پر بھی رہے مشاعروں کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ جب میرے محکمہ میں اُن کے تبادلے کے سلسلہ میں وداعی پارٹی ہوئی تو میں نے ایک وداعی نظم سنائی تھی جس کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے میری شاعری کا کھُل کر اعتراف کرتے ہوئے میری حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد محکمہ کے تمام ساتھیوں کے علاوہ عہدہ دارانِ محکمہ نے بھی مجھے قدر کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ میری وہ نظم آج بھی کے بی لال صاحب کے ڈرائنگ روم میں آویزاں ہے،

کے۔ پی۔ لال صاحب کے زمانے سے ہی میں اپنے محکمہ میں ایک پسندیدہ باأثر شاعر کی حیثیت سے شہرت پانے لگا۔ اس بدلی ہوئی صورتحال کے بعد سکریٹریٹ کے اعلیٰ عہدہ داروں سے میرے مراسم بڑھنے لگے۔

یوں تو میری ملازمت کے دوران کئی اعلیٰ عہدہ دار آتے جاتے رہے لیکن خاص طور پر تلنگانہ کے ہندو مسلم عہدہ داروں سے میرے اچھے خاصے مراسم تھے، جن میں ایک عہدہ دار محسن بن شبیر آئی۔ اے۔ ایس (ڈپٹی سکریٹری) تھے، جنہیں اردو شعروادب سے کافی لگاؤ تھا۔ اُن کی میز پر ہمیشہ منتخب اشعار کی دو ضخیم کاپیاں موجود رہتی تھیں۔ وہ ایک سنجیدہ مزاج عہدہ دار تھے، جن سے تمام ملازمین خوش تھے۔ محمد تاج الدین صاحب (آئی۔ اے۔ ایس) ایک ماہ کے لئے میرے متعلقہ ڈپٹی سکریٹری رہے۔ تاج الدین صاحب کے ہاں جب بھی کوئی فائیل لے کر جاتا تو بڑی محبت سے بٹھاتے، پان پیش کرتے، پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں۔ فائیل کے بارے میں کہتے کہ رکھ دیجئے، دیکھ لوں گا۔ ایک دن فائیل نہ دیکھوں تو کیا دنیا ڈوب جائے گی۔ نہایت نفیس، معتبر اور قابل انسان ہیں۔ اُنہیں بھی شعروشاعری سے دلچسپی ہے۔ اکثر دفعہ وہ اپنی کلکٹری کے زمانے کے خاص خاص واقعات سنایا کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں مسٹر جوہری ڈپٹی سکریٹری (شعبۂ انتظامی) ہوئے۔ مسٹر جوہری ایک نوجوان آئی اے ایس آفیسر تھے۔ لگ بھگ ۳۵، ۳۶ سال کی عمر ہوگی۔ مزاج کے بہت تیز تھے، اور یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ وہ سینے کاندھی کے کلاس میٹ تھے۔ تمام اسٹاف اُن سے گھبراتا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے جائزہ لیا، کچھ دنوں کے بعد ہی بغیر کسی وجہ کے تقریباً ۱۸ سکشن آفیسرز کو ان کے اپنے

سکشنوں سے ہٹا دیا گیا ۔ یہ بات متاثرہ سکشن آفیسرس کو اچھی نہیں لگی۔ مجھے بھی اکاؤنٹس سکشن ع۲ سے ہٹا کر پنچایت سکشن ۱ل میں پوسٹ کیا گیا۔ اُس زمانے میں مسٹر ایم باگا ریڈی منسٹر پنچایت راج ڈپارٹمنٹ تھے (جو میرے ہم جماعت اور دوست ہیں) ۔ میرے ساتھی مجھے اُکسانے لگے کہ مسٹر جوہری کے اس رویے پر انہیں شرمندہ کرنے کے لئے اپنی تعیناتی کے آرڈر منسوخ کروالیئے، منسٹر صاحب آپ کے دوست ہیں، اتنا تو کر سکتے ہیں ۔ ایک دن میں نے باگا ریڈی صاحب سے کہا کہ جوہری صاحب نے بغیر کسی وجہ کے ۱۸ سکشن آفیسرز کے سکشن بدل دیئے ہیں ۔ اتفاق سے اُن سکشن آفیسرز میں سے ایک میں بھی ہوں ۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اُسی سکشن میں رہوں، جہاں میں پہلے تھا۔ (اس لئے کہ وہاں مجھے سکون ہے نہ تو وہاں رشوت لینے کا مسئلہ ہے اور نہ ہی دفتر میں دیر تک بیٹھنے کی پابندی ہے)۔ باگا ریڈی صاحب نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اُنہوں نے سکریٹری صاحب سے بات کی، سکریٹری صاحب نے اُن سے کہا کہ فوری عمل کیا جائے گا۔ لیکن تین ہفتے گذرنے کے بعد بھی کچھ عمل نہیں ہوا، ایک دن میں نے باگا ریڈی صاحب کے نام یہ شعر لکھ کر بھیج دیا ۔ ؎

جہاں چھوڑا تھا مجھ کو زندگی نے
ابھی تک اُسی دوراہے پہ کھڑا ہوں

اتفاق سے اُس وقت اُن کے اجلاس پر میرے ڈپارٹمنٹ کے تمام اعلیٰ عہدیداروں کی میٹنگ ہو رہی تھی ۔ باگا ریڈی صاحب نے جوہری صاحب سے کہا کہ آج ہی صلاح الدین نیّر کے آرڈر جاری کئے جائیں اور اُن کی پوسٹنگ اُسی سکشن میں کی جائے

جہاں وہ پہلے تھے۔ مسٹر جوہری، منسٹر صاحب کے اجلاس سے اپنے روم کو واپس ہوئے اور پاگاریڈی صاحب کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بعد انہوں نے چپراسی کے ذریعہ مجھے بلوایا۔ میں اُس وقت لنچ کے بعد چائے پینے کے لئے اپنے دوستوں کے ساتھ کافی ہاؤز میں بیٹھا تھا۔ وہاں چپراسی آیا اور مجھ سے کہا کہ جوہری صاحب بُلا رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کیوں بُلایا جا رہا ہے۔ میں دستک دے کر جوہری صاحب کے روم میں داخل ہوگیا۔ سلام کر کے کُرسی کھینچ کر اُن کے روبرو بیٹھ گیا۔ مجھے ان کے چہرہ کی رنگت سے اندازہ ہوگیا کہ بغیر اجازت میرا بیٹھنا اُنہیں ناگوار گذرا ہے۔ کیونکہ سکشن آفیسر ہوں یا اسسٹنٹ سکریٹری، دروازہ پہ کھڑے رہ کر اندر آنے کی اجازت مانگتے تھے اور وہ اُس وقت تک کھڑے رہتے جب تک کہ مسٹر جوہری بیٹھنے کیلئے نہیں کہتے۔ مجھ سے انہوں نے خفگی کے ساتھ کہا کہ آپ نے منسٹر صاحب سے میری شکایت کیوں کی۔ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ منسٹر صاحب اگر آپ کے دوست ہیں تو اس سے مجھے کیا۔ اگر میں چاہوں تو آپ کے خلاف ایکشن لے سکتا ہوں (کیونکہ آپ نے منسٹر صاحب سے ڈائرکٹ ملاقات کی ہے)۔ میں نے کہا کہ پاگاریڈی صاحب جہاں میرے متعلقہ منسٹر ہیں وہیں وہ میرے دوست بھی ہیں۔ دوست کی حیثیت سے مجھے یہ حق پہونچتا ہے کہ میں اپنی بات اُن سے کہوں۔ پھر میں نے کہا میری پوری سروس میں آپ پہلے آفیسر ہیں جو اپنے اسٹاف کے ساتھ اس قسم کا نامناسب رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ پھر میں نے کہا آپ کی دعا سے سارا سکریٹریٹ میری ہتھیلی میں ہے۔ میں یہیں سے کسی بھی اعلیٰ عہدہ دار سے یا منسٹر سے فون پر بات کر سکتا ہوں۔ (یہ بات میں نے اس لئے کہی کہ اُن دنوں سکریٹریٹ

کے تمام اُردو جانتے والے منسٹروں اور اعلیٰ عہدہ داروں سے میری اچھی خاصی پہچان تھی، اور وہ میری شاعری اور سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی سرگرمیوں سے واقف تھے)۔ قدرے تاخیر کے بعد جوہری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں نے آرڈر پاس کر دیئے ہیں۔ آپ اپنے سابقہ سکشن میں رہ سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ بات آپ مجھ سے کہہ سکتے تھے، منسٹر صاحب کو زحمت دینے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے جواباً کہا کہ آپ سے کوئی ملازم بھی بات نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ آپ کا رویہ اپنے ماتحتین کے ساتھ اچھا نہیں ہے، معاف کیجئے گا آپ مزاج کے بہت تیز ہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہو چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا میں اتنا بُرا ہوں۔ اس گفتگو کے بعد شکریہ ادا کر کے اُن کے روم سے نکلا اور دوسرے دن میں نے اپنے سابق سکشن میں اپنی نشست سنبھالی۔ کچھ دن بعد مسٹر جوہری نظام آباد کے کلکٹر بن گئے۔ اُن دنوں ٹاؤن ہال نظام آباد میں کسی ادبی انجمن کی جانب سے مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ جب میں حیدرآباد کے شاعروں کے ساتھ مشاعرہ گاہ پہونچا تو وہاں مسٹر جوہری کے علاوہ ریاستی منسٹر مسٹر ستیل سنگھ لشکری اور ڈپٹی اسپیکر اسمبلی جناب سید رحمت علی شہ نشین پر تشریف فرما تھے۔ مسٹر جوہری اور دونوں مہمانوں کو سلام کر کے میں شہ نشین پر مسٹر جوہری کے بالکل بازو بیٹھ گیا۔ مسٹر جوہری نے ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر شیخ سکریٹریٹ میں میرے ڈپارٹمنٹ میں تھے۔ اُن دونوں نے کہا کہ یہ ہمارے شہر کے بہت مشہور شاعر ہیں، یہ ہمارے دوست بھی ہیں۔ اس جواب سے جوہری صاحب کو تھوڑی سی شرمندگی ہوئی۔ اس مشاعرہ کے کچھ مہینوں بعد حکومت کی سطح پر نظام آباد میں

مسٹر جوہری کی نگرانی میں ایک کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا جس میں' میں بھی مدعو تھا۔ (اس مشاعرہ میں خمار بارہ بنکوی نے بھی شرکت کی تھی) مشاعرہ میں مسٹر جوہری نے میرا بھی پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ کچھ دنوں بعد مسٹر جوہری سے سکریٹریٹ میں بھی ملاقات رہی۔ وہ مجھ سے بڑی محبت سے ملے۔

پنچایت راج ڈپارٹمنٹ میں کچھ عرصہ کے لئے مسٹر گرو داس بھی سکریٹری کی حیثیت سے آئے تھے۔ اُن کے دور میں ملازمین انتہائی پُرسکون رہے۔ مسٹر گرو داس کائستھ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا سلوک ملازمین کے ساتھ نہایت دوستانہ رہا۔

سکریٹریٹ کی اپنی ساری مدتِ ملازمت میں' روشن خیال سکریٹری مسٹر مِلن کے سیٹھ کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ اُن کا دور میرے محکمہ کے لئے انتہائی روشن دور تھا۔ اُن کے زمانے میں ملازمین کی ترقی کے لئے جتنے مواقع فراہم ہوئے کسی اور سکریٹری کے دور میں نہیں ہوئے۔ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے ایک جلسہ میں، میں نے اُنہیں مدعو کیا تھا، اس کے بعد سے اُن سے میرے مراسم بڑھنے لگے۔ (اُن کے زمانے میں مسٹر ایس اے واسع ڈپٹی سکریٹری تھے)۔ مسٹر سیٹھ ترقی پسند خیالات کے حامل ایک اعلیٰ آفیسر تھے، انہیں ممتاز شاعر مخدوم محی الدین کی شاعری بہت پسند تھی۔ اُردو زبان سے دلچسپی تھی۔ روانی کے ساتھ اُردو بولتے تھے' البتہ اُردو لکھنے پڑھنے میں اُنہیں دِقت محسوس ہوتی تھی۔ سیاست اخبار کے وہ قاری تھے۔ انہوں نے مجھ سے اُردو پڑھنا شروع کیا۔ میں اُن کے مطالعہ کے لئے اُردو کتابیں دیا کرتا تھا۔ ہفتہ میں ایک دو بار لنچ کے بعد مجھے چائے پر بلاتے۔ یہ اُن کا معمول تھا۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔ جب سکریٹری صاحب سے میرے مراسم کی محکمہ میں

شہرت ہوئی تو بعض ساتھیوں نے سروس کے بعض نازک مواقع پر مجھ سے اصولی طور پر تعاون حاصل کیا۔ سکریٹریٹ کے ہر محکمہ کا یہ طریقہ کار ہے کہ سال، ڈیڑھ سال کے بعد ملازمین کی ترقی کے سلسلے میں پیانل بنتا ہے جس کی منظوری (سکشن آفیسرس اور دیگر گزیٹیڈ پوسٹ) کے لئے متعلقہ ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری کے علاوہ دیگر محکموں کے دو اور سکریٹریز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک پیانل کی منظوری کے بعد دوسرے پیانل کی منظوری کے لئے کم از کم ایک سال کا وقفہ ضروری ہے لیکن مسٹر سیٹھ کی شخصی دلچسپی کی وجہ سے چھ ماہ پہلے ہی میرے ساتھ ہوتے والے سکشن آفیسرس کے پیانل کی منظوری حاصل کی گئی۔ میری خواہش پر مسٹر سیٹھ نے مقررہ طریقۂ کار کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اختیارات کو کام میں لاکر ہمارا پیانل منظور کیا۔ مسٹر ایس۔ اے۔ واسع ڈپٹی سکریٹری نے یہ انکشاف کیا کہ دیگر دو سکریٹریز میں سے ایک نے دستخط کرنے سے تامل کیا تو مسٹر سیٹھ نے اپنا پن اُن کے ہاتھ میں تھما دیا اور یہ کہتے ہوئے دستخط حاصل کی کہ میں اپنے ماتحتین کو اپنے اختیار کے دائرہ میں رہ کر زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانا چاہتا ہوں، کل کا کیوں انتظار کریں۔ کل تو انہیں یہ حق مل ہی جائے گا۔ اس پیانل کی منظوری سے تقریباً ۱۸، ۲۰ اسسٹنٹ سکشن آفیسرس، سکشن آفیسرس بننے کے موقف میں آگئے۔ چنانچہ پیانل کی منظوری کے دوسرے دن سے ہی سلسلہ وار ترقی ملتی رہی۔ مسٹر سیٹھ کے اس مشفقانہ سلوک سے محکمہ میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ایسے مہربان، انسان دوست عہدہ دار بہت کم ملتے ہیں جو اپنے ماتحتین کو فائدہ پہونچا کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔

سکریٹریٹ کے کچھ عہدہ دار جو اپنے دور میں بے حد مقبول رہے

یس۔ اے۔ قادر
ایڈیشنل چیف سکریٹری

سکریٹریٹ کے وہ اعلیٰ عہدہ دار جن سے میرے اچھے خاصے مراسم تھے اور جن کی کرم فرمائیوں سے میں نے بہت سے ملازمین سرکار اور دوسرے اہلِ غرض اصحاب کی مدد کی' انہیں فائدہ پہونچایا' اُن میں سے ایک نام جناب یس۔ اے۔ قادر ایڈیشنل چیف سکریٹری کا بھی ہے۔

جس وقت جناب یس۔ اے۔ قادر ایڈیشنل چیف سکریٹری تھے تو اُس زمانے میں جناب محمد نظام الدین اسسٹنٹ سکشن آفیسر محکمہ ٹرانسپورٹ کی سنیارٹی متاثر ہوگئی تھی۔ جب اُن کی فائل تصفیہ کے آخری مرحلہ پر قادر صاحب کے پاس پہنچی تو نظام الدین صاحب میرے پاس آئے اور سفارش کی خواہش کی۔ ایک دن میں نظام الدین صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر قادر صاحب کے اجلاس پر گیا۔ کیس کے بارے میں تفصیل بتلائی تو قادر صاحب نے کہا کہ یہ فائیل میری میز پر ہے۔ انہوں نے نظام الدین صاحب سے کیس کے بارے میں کچھ استفسارات کیئے۔ مجھ سے کہا کہ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ ایک ہفتہ کے اندر احکامات جاری ہوئے۔ نظام الدین صاحب

کی سینارٹی کا تصفیہ حسبِ منشاء ہوا اور اُنہیں ترقی ملی۔ (اسسٹنٹ سکریٹری بننے کے بعد ریٹائرڈ ہوگئے)۔

ایک اور سفارش کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ممتاز شاعر علی الدین نوید کے بڑے بھائی محمد مصلح الدین، آندھراپردیش پبلک سروس کمیشن میں ٹائپسٹ تھے۔ (اُن دنوں قادر صاحب صدر نشین آندھراپردیش سروس کمیشن تھے) مصلح الدین صاحب کا تبادلہ پبلک سروس کمیشن کی کھمم برانچ پر ہوگیا تھا۔ ایک دن میں مصلح الدین کو اپنے ہمراہ لے کر قادر صاحب کے گھر واقع حمایت نگر پہونچا، ساری تفصیل بتلائی، قادر صاحب نے فی الفور تبادلے کے آرڈر کو منسوخ کیا اور مجھ سے کہا کہ اگر آئندہ ایسی کوئی بات ہو تو مجھ سے ملنے میں تکلف نہیں کرنا، میں ہر منزل پر ہر ممکن تعاون کروں گا۔ ایس۔ اے۔ قادر صاحب سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے پہلے سرپرست اعلیٰ تھے۔ ان کے زمانے میں سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے بہت سے اچھے اچھے پروگرامس ہوئے۔ ایک پروگرام جو سکریٹریٹ کے کمیٹی ہال میں منعقد ہوا تھا۔ قادر صاحب نے بھی شرکت کی تھی، جلسہ اُنہیں کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ ایسے مہذب، شائستہ اور ماتحت نواز اعلیٰ عہدہ داروں کے نام سکریٹریٹ کی تاریخ میں جگمگاتے رہیں گے۔



بھارت چند کھنہ آئی۔اے۔ایس

جناب بھارت چند کھنہ نے میرے کہنے پر بے شمار نوجوانوں کے پاسپورٹ

فارم کی تصدیق کی۔ جن کی وجہ سے کئی مسلم نوجوان بآسانی پاسپورٹ حاصل کرسکے جو آج خلیجی ممالک کے علاوہ امریکہ، شکاگو، کناڈا، لندن اور دیگر ممالک میں اچھی اچھی خدمات پر فائز ہیں۔ اُس زمانے میں پاسپورٹ بنانے کے لئے ڈپٹی سکریٹری سطح کے آفیسر کی پاسپورٹ فارم پر دستخط ضروری تھی۔ (آج بھی ضروری ہے)۔ ایک مرتبہ یوں ہوا کہ میرے ایک رشتے دار کا لڑکا پاسپورٹ فارم پر تصدیق کے لئے میرے پاس آیا۔ کھنہ صاحب اُن دنوں سکریٹری گورنر آندھراپردیش تھے۔ میں نے کھنہ صاحب کے پاس اپنا ویزیٹنگ کارڈ بھجوایا۔ انہوں نے مجھے فوری بلوایا۔ چائے پلوائی۔ میں نے فارم پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ نوجوان باہر بیٹھا ہوا ہے، آپ کہیں تو استفسارات کے لئے بُلا لوں۔ کھنہ صاحب نے کہا کہ میرے لئے یہی کافی ہے کہ آپ لائے ہیں۔ اُن کے اس پُر اعتماد جواب نے مجھے ہمیشہ کے لئے اُن کا گرویدہ بنا دیا۔

کھنہ صاحب سیدھے سادے، نیک سیرت اور وضع دار ہونے کے علاوہ حیدرآبادی تہذیب کا مکمل نمونہ ہیں۔ وہ پاسپورٹ فارم ہو یا کوئی دستاویز بلا تامل دستخط کیا کرتے تھے۔ صدر سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی حیثیت سے بھی اُن کا ہمیشہ تعاون حاصل رہا۔ وہ ایک کامیاب طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے بھی اُردو ادب میں اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔



سید ہاشم علی اختر آئی اے ایس

جس زمانے میں جناب سید ہاشم علی اختر اریگیشن ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری تھے تو [illegible] میرے ایک دوست جناب بشیر انور اسسٹنٹ سکشن آفیسر تھے۔ جب ہاشم علی اختر صاحب سکریٹریٹ کے ایک نئے محکمہ کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ کے سکریٹری بن گئے تو میری سفارش پر بشیر انور صاحب کو اپنے محکمہ میں لے لیا چونکہ یہ ایک نیا ڈپارٹمنٹ تھا اس لئے بشیر انور اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں وقت سے پہلے سکشن آفیسر ہو گئے۔

ہاشم علی اختر صاحب کی عنایتوں کا ایک اور واقعہ کچھ اس طرح ہے۔
میرے ایک دوست محبوب احمد محکمہ روڈز بلڈنگس میں اسسٹنٹ انجینئر تھے۔ محکمہ کی لاپرواہی کی وجہ سے اُن کے پرموشن کا کیس متاثر ہو گیا تھا۔ بمشکل تمام ان کا نام پینل میں شریک کیا گیا تھا۔ پینل کی منظوری کے ایک رکن سکریٹری ممبر کے۔ ایم۔ احمد بھی تھے جن سے سفارش کروائی تھی۔ میں محبوب احمد صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر ہاشم علی اختر صاحب کی قیام گاہ (مہدی نگر کالونی) پہنچا۔ (محبوب احمد صاحب گھر میں نہیں آنا چاہتے تھے، وہ باہر ہی موٹر میں بیٹھے رہے) ہاشم علی اختر صاحب ڈرائنگ روم میں سے باہر آئے اور اپنے ساتھ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ رمضان کا مہینہ تھا، افطار کے بعد مجھے بھی ناشتہ میں شامل کیا گیا جب میں نے اُن سے ملاقات کی وجہ بتلائی اور کہا کہ میرے ایک دوست محکمہ کے

عدم تعاون کا شکار ہو چکے ہیں۔ اگر آپ اصولی طور پر اعانت فرمائیں تو میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔ ہاشم صاحب نے فی الفور کے۔ ایم۔ احمد صاحب کو فون کیا، اللہ کے فضل سے سفارش کام آئی اور پی آر کی منظوری کے بعد بہت جلد محبوب احمد صاحب کو ترقی مل گئی۔ ہاشم علی اختر صاحب کے لئے یہ بہت معمولی کام تھا۔ انہوں نے دورانِ ملازمت بہت سے مستحق اور ضرورت مند اصحاب کی مدد کی ہے۔ ہاشم علی اختر صاحب ہمیشہ مجھ سے خندہ پیشانی سے ملتے رہے، وہ میری شاعری سے بہت متاثر ہیں، مجھے مشورہ دیتے تھے کہ میں اپنا کلام ہندی رسم الخط (دیوناگری) میں شائع کرواؤں۔ مجھ سے کہتے کہ میں قلم کا مزدور ہوں۔ وہ رات فیض احمد فیض کے ڈاکٹر محمد سلیم سنیچوار ریڈی کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے۔ ہاشم علی اختر صاحب نے نہایت دیانت دار، فرض شناس، بامروت اور بے باک آفیسر کی طرح سکریٹریٹ کے در و دیوار پر اپنی شرافت کے گہرے نقوش چھوڑ چکے ہیں۔ سکریٹریٹ کی پچھلی روایات کو چمکانے والوں میں ہاشم علی اختر صاحب کا نام بھی سرِ فہرست رہے گا۔



غلام احمد

جوائنٹ سکریٹری

غلام احمد صاحب سکریٹریٹ کے اُن خوش مزاج، خوش اخلاق اور دلنواز عہدہ داروں میں سے ایک تھے، جنھوں نے مجھ سے مستحق نوجوانوں کے تقررات

اور پریشان حال ملازمین کے تبادلوں کی منسوخی کے علاوہ بعض سرکاری اور غیر سرکاری امور میں بھی بھرپور تعاون کیا۔ میں جب بھی اُن سے ملنے جاتا انتہائی خلوص کے ساتھ پیش آتے۔ سگریٹ پیش کرتے، چائے نوشی ہوتی اور کہتے بولو کیسے آنا ہوا۔

غلام احمد صاحب کا اجلاس ایک شاہی دربار جیسا تھا مگر فقیرانہ رنگ لئے ہوتا۔ ہر قسم کے ضرورت مند اصحاب کے علاوہ دوست احباب کی آمد کا سلسلہ دفتر کے شروع ہونے سے ختم ہونے تک جاری رہتا۔ ہر شخص کی مدد کرتے۔ ایسا یار باش عہدیدار سکریٹریٹ کو پھر نصیب نہ ہوسکا۔ سفارش کرنے کے معاملے میں وہ بہت سخی واقع ہوئے تھے۔ کوئی شخص اُن کے قلندرانہ دربار سے خالی ہاتھ نہیں گیا۔ صدر سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔



یس۔ اے۔ واسع

جوائنٹ سکریٹری

جس وقت جناب یس۔ اے۔ واسع محکمہ ٹرانسپورٹ میں اسسٹنٹ سکریٹری تھے تو میری اُن سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اُنہیں شعر و ادب سے کافی دلچسپی تھی۔ میں اُن کی خواہش پر اُنہیں مختلف شعراء کا کلام پڑھنے کیلئے دیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ ہمارے روابط بڑھتے گئے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ

وہ میرے محکمہ میں ڈپٹی سکریٹری کی حیثیت سے آئے۔ پھر تو ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ ان کی پُرکشش شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی کہ بار بار ملنے کو جی چاہتا تھا۔ واسع صاحب صیغۂ انتظامی (او-پی) کے ڈپٹی سکریٹری تھے۔ ان کے تحت ملازمین کے بہت سے مسائل حل طلب رہا کرتے تھے، جیسے مختلف سکشنس میں تعیناتی، پرموشن کیسس، رخصتیں، مکانات اور موٹر سیکل کے قرضہ جات وغیرہ اُن سے روابط کی بنیاد پر میں نے اپنے آفس کے ساتھیوں کی بہت مدد کی ہے۔ واسع صاحب میری ہر بات کا خیال رکھتے تھے۔ اُس زمانے میں آندھرا کے ایک ٹائپسٹ مسٹر نرسمہا راؤ نے اپنی بعض خانگی اُلجھنوں کی وجہ سے ملازمت سے استعفیٰ دیدیا تھا۔ ایک دن وہ مجھ سے اور میرے ساتھی خواجہ بہاء الدین سے ملے اور نم دیدہ ہو کر کہا کہ میں بہت پریشان ہوں، استعفیٰ واپس لینا چاہتا ہوں۔ میری مدد کیجئے۔ ہم دونوں نے واسع صاحب سے سفارش کی اور انہوں نے استعفیٰ منظور ہونے کے باوجود اس کو دوبارہ ملازمت میں لے لیا۔ آج وہ ٹائپسٹ، ہوم ڈپارٹمنٹ کا سکشن آفیسر ہے۔ واسع صاحب کا دور ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کے لئے ایک سنہرا دور تھا۔ اُن کے زمانے میں کسی بھی ملازم کی حق تلفی نہیں ہوئی۔ واسع صاحب اپنے رکھ رکھاؤ، بہترین سلوک اور اپنے باوقار لب و لہجہ کی وجہ سے کافی شہرت رکھتے تھے۔ اُن میں اعلیٰ آفیسر کی وہ تمام خصوصیات شامل تھیں جو اُن کے عہدہ کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ وہ ایک خوش مزاج اور خوش نظر عہدہ دار کی حیثیت سے بھی پسند کئے جاتے تھے۔ انہوں نے ہمیں محسوس ہی ہونے نہیں دیا کہ وہ ہمارے آفیسر ہیں۔ خاص طور پر خواجہ بہاء الدین اور مجھ سے وہ بہت

کھل کر گفتگو کرتے تھے، دوستوں کی طرح۔ اُس وقت ان کی بذلہ سنجی اور رنگ لاتی جب اُن کے روم میں ایس۔ اے۔ عزیز، خواجہ بہاءالدین وغیرہ موجود ہوتے۔ ان نشستوں کے بعض لمحات ہمیشہ یاد رہیں گے

واسع صاحب جب سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے صدر ہوئے تو انہوں نے اسوسی ایشن کے لئے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے۔ اُن ہی کے زمانے میں بڑے بڑے جلسے ہوئے۔ سکریٹریٹ کی تاریخ میں ایک دستاویزی مجلہ شائع کیا گیا تھا (جس کو میں نے ترتیب دیا تھا) جس میں محکمہ کی ایسی نمائندہ شخصیتوں، اُردو دوستوں (سکریٹری سے لے کر ایل۔ ڈی۔ سی) تک کے گروپ فوٹوز شامل کئے گئے ہیں جو اُردو زبان و ادب سے محبت رکھتے ہیں۔



محمد تاج الدین آئی۔اے۔ایس

جناب تاج الدین، ضلع عادل آباد، کی کلکٹری کرنے کے بعد جب پنچایت راج ڈپارٹمنٹ میں ڈپٹی سکریٹری کی حیثیت سے آئے تو یہ بات عام ہوگئی تھی کہ وہ ایک نیک دل، باصلاحیت، بامروت اور ملازمین کے ساتھ ہمدردانہ سلوک رکھنے والے عہدہ دار ہیں۔ تاج الدین صاحب مجھ سے غائبانہ طور پر واقف تھے۔ ایک دن جب وہ اپنے روم سے نکل کر سکریٹری کے پاس جارہے تھے تو میں نے

اُنہیں سلام کیا ، اُنھوں نے مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور کہا کہ مجھ سے کبھی مل لیجئے۔ میں دوسرے دن ان کے اجلاس پر چلا گیا۔ سلام کے بعد انہوں نے بیٹھنے کے لئے کہا اور پان کی ڈبیہ میرے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا کہ آپ کون سے سکشن میں کام کرتے ہیں۔ میں آپ سے واقف ہوں ، آپ کی شاعری سُنتا اور پڑھتا رہتا ہوں۔ اس پہلے تعارف کے بعد اُن سے ملنے کے لئے کبھی کبھی جایا کرتا تھا ، دیر تک وہ اپنے پاس بٹھاتے ، اپنی کلکٹری کے خاص خاص واقعات سناتے شعر و شاعری کے موضوع پر گفتگو کرتے۔ اُنہیں مجھ سے کافی لگاؤ ہو گیا تھا۔ اپنے وظیفہ سے پہلے وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی کھُل گئے تھے۔ اُن کی جس بات نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ اُن کی مشفقانہ طبیعت تھی اور وہ خلوص آمیز رویہ تھا جو ہمیشہ محبت کرنے والوں کی جھولیاں بھر دیتا ہے۔



بی۔ این۔ واگھرے آئی اے ایس

واگھرے صاحب سے میری پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جب وہ ایک دن لنچ کے بعد اپنے روم میں صوفے پر لیٹے ہوئے نیند کی آغوش میں جانے والے تھے۔ جیسے ہی میں دستک دے کر کمرہ میں داخل ہوا ، واگھرے صاحب چونکے۔ میں واپس ہوا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے لیٹے ہوئے ہی کہا کہ فائیل

میز پر رکھ دیجئے ' بعد میں دیکھ لوں گا۔

سکریٹریٹ میں تلنگانہ کے بعض ایسے وضع دار آفیسر بھی رہے جو اپنے ماتحتوں سے ہمیشہ دوستانہ اور برادرانہ سلوک روا رکھتے تھے ' اُن میں سے ایک ایسے ہی آفیسر واگھرے صاحب تھے۔ واگھرے صاحب کچھ دنوں کے لئے میرے سکشن (جائنٹ سکشن) کے انچارج ڈپٹی سکریٹری رہے۔ دوسری دفعہ میں اور میرے ایک دوسرے سکشن آفیسر ساتھی قادری صاحب اپنی اپنی فائیلیں لے کر واگھرے صاحب کے اجلاس پر پہنچے۔ قادری صاحب اور واگھرے صاحب کے دیرینہ مراسم تھے۔ قادری صاحب نے واگھرے صاحب کے سامنے پان کی ڈبیہ بڑھا دی۔ اس کے بعد مختلف فائیلوں پر گفتگو رہی۔ قادری صاحب نے اپنی ایک فائیل جس کا ٹائپ شدہ نوٹ ڈیڑھ صفحہ کا تھا ' واگھرے صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ واگھرے صاحب نے قادری صاحب سے کہا کہ قبلہ پڑھئے تو کیا لکھا ہے آپ نے ؟ قادری صاحب نصف صفحہ بھی پڑھنے نہ پائے تھے کہ اُنہیں نیند کا جھونکا آ گیا اور ان کی گردن بائیں جانب ڈھلک گئی لیکن انگلی اُسی سطر پر تھی جس وقت نیند کا جھونکا انہیں آیا تھا۔ جیسے پڑھتے پڑھتے قادری صاحب رُک گئے تو واگھرے صاحب نے کہا آگے مرشد ! آگے پڑھئے۔ قادری صاحب چونکے ' انہوں نے پھر پڑھنا شروع کیا ' کچھ اور سطروں کے بعد قادری صاحب کو پھر نیند کا جھونکا آ گیا تو واگھرے صاحب نے کہا کہ پھر سو گئے قبلہ ! اس کے بعد واگھرے صاحب نے قادری صاحب سے فائیل لے لی۔ قادری صاحب نے سہواً یا بے خیالی میں پی۔ ٹی۔ او کی جگہ دستخط کئے تھے ' یہ سمجھ کر کہ نوٹ ختم ہو گیا ہے۔ واگھرے صاحب نے کہا کہ

باجی جناب! یہ کیا کیا آپ نے۔ نوٹ ابھی ختم کہاں ہوا ہے۔ واگمرے صاحب نے مسکراتے ہوئے فائیل پاس کردی۔ ایسے اعلیٰ ظرف، خوش مزاج آفیسر بہت کم ملتے ہیں جو سکریٹریٹ کے لئے ایک قیمتی ورثہ تھے۔



یس۔ اے۔ عزیز

اڈیشنل سکریٹری

جناب یس۔ اے۔ عزیز جس وقت محکمۂ جنرل اڈمنسٹریشن میں ڈپٹی سکریٹری (اکاموڈیشن) تھے، تو انہوں نے میری خواہش پر بعض اصحاب کے مکانات کے الاٹمنٹ میں مجھ سے مکمل تعاون کیا۔ وہ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے نائب صدر تھے۔ اسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ عزیز صاحب ایڈیشنل سکریٹری جنرل ایڈمنسٹریشن کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے۔

عزیز صاحب سے میری ملاقات زیادہ تر جناب ایس۔ اے۔ واسع، جوائنٹ سکریٹری پنچایت راج کے روم میں ہوا کرتی تھی، سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے مختلف پروگرامس کی صورت گری کے سلسلے میں مفید مشوروں سے نوازتے تھے۔ نہایت سیدھے سادے، شریف النفس انسان تھے۔ اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود بھی انہوں نے اپنے سکریٹریٹ کے قدیم ساتھیوں کو کبھی فراموش نہیں

گیا۔ ان میں کبھی بھی آفیسرانہ شان نظر نہیں آئی۔ مجھ سے تو وہ ایک بڑے بھائی کی طرح ملتے تھے۔ ایسے ہی آفیسرز سے سکریٹریٹ کی رونق تھی۔ یکے بعد دیگر ایسے بہترین انسانوں اور نفیس عہدیداروں سے سکریٹریٹ خالی ہوتا جارہا ہے جب بھی سکریٹریٹ جاتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ لوگ اب بھی اپنی کرسیوں پر موجود ہیں۔



صادق احمد

جوائنٹ سکریٹری

صادق احمد صاحب سے میری پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جبکہ وہ محکمۂ قانون میں اسسٹنٹ سکریٹری تھے (جو جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہوگئے)۔ انہیں اُردو شعر وادب سے اچھا خاصا شغف ہے۔ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے پروگرامس میں کافی دلچسپی لیتے رہے۔ وہ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے تقریباً ۴ سال تک صدر رہے۔ ہفتہ میں ایک دن اُن کے روم میں محفلِ شعر ہوتی۔ جس میں ہم (خواجہ بہاء الدین، عباس ہاشمی، ڈاکٹر منیر الزماں منیر، شکیل احمد، محمد قمر الدین صابری، کشتیا کرن وغیرہ) اُن کے روم میں جمع ہوتے۔ چائے نوشی ہوتی۔ کمرہ بند کیا جاتا۔ چپراسی کو ہدایت دی جاتی کہ

نصف گھنٹے تک کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔ ان کے ماتحت ایک سکشن آفیسر (جو ایک نومشق شاعر تھے) کی یہ خواہش تھی کہ ان کا جشن منایا جائے۔ ہم نے شرارتاً حامی بھرلی اور اُن سے ابتدائی تیاریوں کے لئے کچھ روپے لے لئے، مختلف عنوانات کے تحت روپے خرچ کئے جاتے رہے لیکن ان کا جشن نہیں منایا گیا۔ جشن کمیٹی کا سکریٹری عباس ہاشمی صاحب کو بنایا گیا تھا (جو اب بعہدہ ضلع عادل آباد میں کمشنر بلدیہ ہیں)۔ وہ اپنے طریقہ سے کبھی مٹھائی منگوا کر اور کبھی چائے نوشی پر جشن کے ابتدائی اخراجات کیا کرتے تھے۔ دراصل ہم سبھوں نے ایک سنجیدہ مذاق کیا تھا۔ صادق احمد صاحب ایک اچھے ادیب ہیں۔ روزنامہ سیاست میں مختلف موضوعات پر ان کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

صادق احمد صاحب کے زمانے میں بھی سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے بعض خاص فنکشن ہوئے۔ صادق صاحب نے بھی اُردو اسوسی ایشن کو پروان چڑھانے میں پُرخلوص تعاون کیا۔



سیّد تراب الحسن آئی۔اے۔ایس

جناب سیّد تراب الحسن سے میری پہلی ملاقات جگتیال کے ایک کُل ہند مشاعرہ میں ہوئی جس کے وہ روحِ رواں تھے۔ تراب الحسن صاحب اُس زمانے

میں تعلقہ جگتیال پر اڈمنسٹریٹر سری رام پراجکٹ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے
اُس مشاعرہ میں بیکل اتساہی نے بھی شرکت کی تھی۔ حیدرآباد سے ہم تمام شاعر
بذریعہ موٹر کار مشاعرہ میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ جگتیال سے ۸ - ۱۰ میل
پہلے ہماری موٹر خراب ہوگئی۔ مشاعرہ کا وقت قریب آرہا تھا، کسی ایک سواری کا
مسئلہ درپیش تھا۔ آخر کار ایک ایسی لاری ہمیں مل گئی جس میں سے کچھ دیر پہلے ہی
کوئلہ اُتارا گیا تھا۔ لاری میں کوئلے کے ریزے بکھرے پڑے تھے۔ اس کے باوجود ہمیں
اُس لاری میں سفر کرنا پڑا۔ (شاعروں کو کبھی کبھی ایسے حالات سے بھی گذرنا پڑتا ہے)
اُس مشاعرہ کی صدارت مسٹر بی۔ ایں۔ رامن آئی اے ایس نے کی تھی' جو بعد میں
چیف سکریٹری کے عہدہ پر فائز رہے۔ تراب الحسن صاحب ایک حرکیاتی شخص کا نام
ہے' نہایت معتبر' ہمدرد' دوست قسم کے انسان ہیں۔ قلندر مزاجی ان کا ایک
اہم وصف ہے۔ جب صادق احمد صاحب کو وظیفہ ہوگیا تو تراب الحسن اڈیشنل
اگریکلچر پروڈکشن کمشنر کو سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کا صدر بنایا گیا۔ آج بھی
وہ صدر ہیں۔ اسوسی ایشن کی سرگرمیوں کو پروان چڑھانے کے سلسلے میں مجھے
تراب الحسن صاحب سے ہمیشہ اعانت حاصل رہا کرتی ہے۔ ہر ضرورت مند پریشان
ملازمین کی مدد کرنا ان کا وطیرہ تھا۔

سعادت علی نامی ایک صاحب جو کسی محکمہ میں یو۔ ڈی۔ سی تھے،
کا تبادلہ کسی ضلع پر ہوگیا تھا' وہ چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر کسی صورت
میں بھی جانا نہیں چاہتے تھے' ان کا بیان تھا کہ اُن کی والدہ بیمار ہیں۔ وہ انہیں
چھوڑ کر ضلع پر نہیں جاسکتے۔ مجھ سے کہنے لگے' آپ چاہیں تو میرا تبادلہ منسوخ

ہوسکتا ہے۔ میں نے آپ کے بارے میں سُنا ہے کہ آپ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر بے لوث خدمات انجام دیا کرتے ہیں۔ میں نے اُس شخص کی ساری باتیں سُنیں، اُس کو نم دیدہ دیکھ کر ایک چٹھی تراب الحسن صاحب کے نام لکھ دی اور فوراً اس پریشان حال شخص کی مدد کرنے کی خواہش کی۔ چند دنوں کے بعد وہ صاحب مٹھائی کا ڈبہ لے کر میرے ہاں سکریٹریٹ آئے۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت ان کی آنکھوں میں اظہار تشکر کے آنسو تھے۔



رمن راؤ آئی۔اے۔ایس

اپنی مختلف خوبیوں اور عمدہ خصوصیات کی بناء پر مسٹر رمن راؤ بھی سکریٹریٹ کے اعلیٰ عہدہ دار کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے۔ رمن راؤ صاحب کئی برسوں تک سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے نائب صدر رہے۔ اُردو زبان سے اچھی طرح واقف ہیں، اُردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ شعر و ادب سے کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ سکریٹریٹ کے بیڈ بائی پروگرامس میں حصہ لیتے رہے ہیں سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے مختلف پروگرامس کے سلسلہ میں اُن کی مشاورت کو بھی اہمیت حاصل رہی ہے۔ صنعتی نمائش کے موقع پر گذشتہ ۱۲ سال سے نمائش کلب میں سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے میوزیکل پروگرامس ہوتے

متعلقہ ملازمین کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ خواجہ صاحب سے پہلی اور بعد کی ملاقاتوں کے دوران میں نے محسوس کیا کہ وہ نہایت فرض شناس، دیانت دار، ہمدرد انسان ہیں۔ خواجہ صاحب سے میری ملاقات کم کم ہی رہتی تھی، چونکہ میں ان کا بالراست ماتحت نہیں تھا۔

اکثر اوقات گزیٹیڈ آفیسر کے دستخط کی ضرورت معاشرہ میں دیگر لوگوں کے علاوہ خاص طور پر کالجوں کے طلباء کے فارمس پر بطور تصدیق پیش آتی رہتی ہے۔ میں نے خواجہ صاحب سے بے شمار طلباء اور اہلِ غرض اصحاب کے لئے تعاون حاصل کیا ہے۔ خواجہ صاحب نے کبھی بھی تصدیق کے لئے تامل نہیں کیا۔ اُن کا اپنا ایک طریقہ کار تھا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر ہر متعلقہ مقام پر اور ہر متعلقہ سرٹیفکٹ پر دستخط کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے پوچھا کہ آپ فارمس پر بلا تامل دستخط کیا کرتے ہیں، آپ جاننا بھی نہیں چاہتے کہ متعلقہ شخص کون ہے، فارمس اور سرٹیفکٹس کس کے ہیں، صحیح ہیں کہ نہیں۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ میں اللہ کا نام لے کر کام کرتا ہوں۔ صحیح یا غلط کے بارے میں نہیں سوچتا، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر کام شروع کرنے کے بعد ہر مشکل آسان ہوجاتی ہے۔ ویسے بھی جتنی بھی نیکیاں ممکن ہوں کرنی چاہیئے۔ خواجہ صاحب نہایت سیدھے سادے خدا ترس ہمیشہ کی طرح یاد کئے جاتے رہیں گے۔ ہمیشہ شیروانی پہنے ہوئے سر پر رومی ٹوپی، ایک وضع دار شخص کی طرح اپنی انفرادیت کو باقی رکھا کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی اعلیٰ عہدہ داروں سے نظریں جھکا کر بات نہیں کی۔

خواجہ صاحب کا سلوک اپنے ماتحتین سے دوستانہ تھا۔ تمام ماتحت اُن سے مکمل تعاون کیا کرتے تھے۔ ان کی انسان دوستی کا صرف ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں (یہ بات مجھے میرے ساتھی خواجہ بہاء الدین) نے بتائی پہلی تاریخ تھی، خواجہ صاحب تنخواہ لے چکے تھے۔ کسی یتیم خانہ کے کچھ سربراہ ان کے پاس آئے، وہ ان کی باتوں سے کچھ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنی ساری تنخواہ اُن کے حوالے کر دی۔



عبدالمحمود

اسسٹنٹ سکریٹری

جناب عبدالمحمود سے سکریٹریٹ میں میری کبھی کھل کر گفتگو نہیں ہوئی البتہ اُن سے ایک سرسری ملاقات کا خیال آتا ہے، شاید میں پہلی دفعہ ان سے ایک سرٹیفکیٹ پر دستخط لینے کے لئے ملا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ محکمہ تعلیمات میں اسسٹنٹ سکریٹری تھے، پھر وہ ۱۹۶۷ء میں آصفیہ لائبریری کے ڈائرکٹر بن کر کچھ عرصہ وہاں کام کرنے کے بعد نظامس اُردو ٹرسٹ سے وابستہ ہو گئے اور اب وہ کئی برسوں سے سکریٹری نظامس اُردو ٹرسٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ محمود صاحب کو سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی سرگرمیوں سے دلچسپی لینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اگر وہ کچھ مدت کے لئے

سکریٹریٹ میں رہتے تو ان کی خدمات سے بھی استفادہ کیا جا سکتا تھا۔

نظامس اُردو ٹرسٹ کی جانب سے اُردو کی اچھی اور معیاری کتابوں کی اشاعت کے لئے جزوی طور پر رقمی اعانت کی جاتی ہے۔ میری سفارش کی پذیرائی کرتے ہوئے انہوں نے بہت سے مستحق اہل قلم کی کتابوں کی اشاعت کے لئے فراخ دلی کے ساتھ امداد دی ہے۔ خود میں نے بھی اپنے ایک شعری مجموعہ کی اشاعت کے لئے تعاون حاصل کیا ہے۔ میں نے بھی یہ محسوس کیا ہے کہ محمود صاحب شریف النفس انسان ہیں، شائستگی اور نفاست اُن کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ مسکراتے ہوئے شگفتہ اور پُر اثر لب و لہجہ میں اپنی بات منوانے کا سلیقہ ہے۔ نہایت نفیس، خوش مزاج اور متوازن انداز فکر رکھنے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ مخلصانہ روابط کی پاسداری میں وہ کافی فیاض واقع ہوئے ہیں۔ کسی ایسے مسئلہ پر جو اُن سے تعاون کا طلب گار رہتا ہے، تو جو واقع ہوں تو مجھے مایوسی نہیں ہوتی۔ مزاج کی شائستگی کا ہی یہ فیضان ہے شاید کہ وہ ادبی و علمی حلقوں میں محترم سمجھے جاتے ہیں۔



مُبشّر احمد

جوائنٹ سکریٹری

مبشر احمد صاحب اُردو کے ایک اچھے ادیب و نقاد ہیں جو جوائنٹ

سکریٹری فنانس اینڈ پلاننگ ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت سے ریٹائر ہو چکے ہیں اور ان دنوں پرنسس اسریٰ ہاسپٹل میں ایڈمنسٹریٹر کی خدمت پر مامور ہیں۔ مبشر احمد صاحب کچھ مہینوں کے لئے میرے محکمہ پنچایت راج میں اسسٹنٹ سکریٹری رہ چکے ہیں۔ سکریٹریٹ میں ان کے دوست و احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ نہایت ملنسار، خوش اخلاق، ہمدرد، مخلص، دوست نواز آفیسر تھے۔ ہر مستحق شخص کی مدد کرنا گویا ان کی ذمہ داری میں داخل تھا۔ مبشر احمد صاحب سے میرے بہت اچھے مراسم تھے، آج بھی میں اُن کی اسی طرح عزت کرتا ہوں، جس طرح میں سکریٹریٹ کی ملازمت کے دنوں میں کیا کرتا تھا۔

یوں تو میں نے مبشر احمد صاحب کی عنایتوں سے بہت سے مستحق، ضرورتمند اور اہل غرض حضرات کی مدد کی ہے لیکن ایک اہم کام کے سلسلے میں انہوں نے جو میری اعانت کی تھی، وہ ناقابل فراموش ہے۔ اُن دنوں میرے ایک دوست کی بہنیں ویمنس کالج (کوٹھی) میں پڑھا کرتی تھیں۔ اُن لڑکیوں کے دو بھائی سرکاری ملازم تھے اور اتفاق سے دونوں اضلاع پر تھے۔ گھر میں ان لڑکیوں کے سوا اُن کی ماں اور ایک ملازمہ رہتی تھی۔ ایک دن مجھ سے کہا گیا کہ بچیاں جب بھی کالج کے لئے گھر سے نکلتی ہیں اور لوٹتی ہیں تو پڑوسی کا لڑکا جملے کستا رہتا ہے اور انہیں دیکھ کر گھٹیا قسم کے فلمی گانے گاتا ہے۔ میں نے سُن کر کہا کہ اس کا انتظام ہو جائے گا۔ یہ بات میں نے مبشر احمد صاحب سے کہی (جبکہ وہ میرے محکمہ میں اسسٹنٹ سکریٹری تھے)۔ چونکہ اُن کے ایک بہنوئی خواجہ الطاف احمد اسسٹنٹ کمشنر کرائم برانچ (کنٹرول روم)

تھے۔ ایک دن میں، مبشر احمد صاحب اور اُن کے ہوم ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھنے والے ایک ساتھی جناب امیر علی صاحب کے ساتھ الطاف صاحب کے آفس پہونچا۔ اُن سے ساری باتیں کہہ دیں۔ الطاف احمد صاحب نے فوری متعلقہ ایجنا کو بلوایا، ساری تفصیلات بتلائیں۔ اُسی رات ۱۲ بجے کے بعد اُس لڑکے کو پکڑ کر لے گئے اور حوالات میں بند رکھا۔ تمام رات اُس کی خوب پٹائی کی۔ دوسرے دن سخت وارننگ دے کر اُس لڑکے کو چھوڑ دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد اُس لڑکے نے دوبارہ سر نہیں اٹھایا۔ اس دوستانہ تعاون کے لئے میں آج بھی مبشر احمد صاحب سے ممنونیت کا اظہار کرتا ہوں۔

وقت گذر جاتا ہے لیکن ایسے محسنین کو بھلایا نہیں جاسکتا جو نازک مواقع پر کبھی ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں۔



رشید قریشی

جوائنٹ سکریٹری

رشید قریشی صاحب کو میں ایک ادیب، ڈرامہ نگار اور طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے جانتا تھا۔ وہ اسسٹنٹ سکریٹری کی حیثیت سے پنچایت راج ڈپارٹمنٹ میں کچھ عرصہ رہے۔ پہلے وہ ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ

امتحان دے کر نتیجہ کا انتظار کر رہے تھے۔ اُن دنوں ڈاکٹر صادق نقوی اُن کے قریب ترین دوستوں میں سے ایک تھے، جنھوں نے سعد حسین سعد سے میرا تعارف کروایا تھا۔ سعد حسین سعد مدینہ ہوٹل میں تنہا ایک الگ گوشہ میں بیٹھا کرتے تھے، بلا کے سگریٹ نوش تھے۔ ویسے بھی اُن دنوں چار مینار سگریٹ پینا دانشوروں اور بے روزگار نوجوانوں کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ ایک وقت آیا کہ وہ ٹریننگ کے دوران ایلور (ویسٹ گوداوری) پر ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے مامور ہوئے۔

سعد حسین سعد ابتدائی ملازمت کے بعد بھی سکریٹریٹ میں کچھ زیادہ دنوں کے لئے نہیں رہے۔ لیکن جب بھی وہ سکریٹریٹ میں رہے۔ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے شعری و ادبی ریڈیائی پروگرامس میں حصہ لیتے رہے، اُن دنوں انہیں نائب صدر اسوسی ایشن نامزد کیا گیا۔

سعد حسین سعد سے میرا تعلق کبھی بھی ماتحت اور آفیسر کا نہیں رہا، انہوں نے میرے محکمہ میں کبھی بھی کام نہیں کیا۔ ہمارے روابط ہمیشہ دوستانہ انداز کے رہے (اب بھی ہیں)۔ میں نے بہت سے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور ضرورت مند اصحاب کے پاسپورٹ فارمس اور مختلف نوعیت کے سرٹیفکٹس پر بطور تصدیق سعد حسین صاحب سے دستخط کے لئے تعاون حاصل کیا ہے۔ انہوں نے میری کسی بھی سفارش کو نظر انداز نہیں کیا۔ نہایت شریف النفس، ملنسار، خوش مزاج اور نرم گفتار انسان ہیں۔ متین، سنجیدہ ۔ دیانت دار اور معتبر اعلیٰ آفیسر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

سعد حسین سعد ایک اچھے شاعر بھی ہیں، جو مشاعروں کی ہنگامہ آرائیوں سے دور دور رہتے ہیں لیکن میں بعض خاص خاص مشاعروں میں بااصرار انہیں مدعو کرتا رہتا ہوں۔ اُن کے قریبی دوستوں میں ممتاز میونسپل خواجہ بہاءالدین بھی ہیں، جو اُن کا کلام ٹیلی ویژن اور آل انڈیا ریڈیو کے علاوہ مختلف تہذیبی پروگراموں میں پیش کرتے ہیں۔ سعد حسین سعد: سکریٹریٹ میں ایڈیشنل سکریٹری محکمہ ویمنس ڈیولپمنٹ چائلڈ ویلفیر اینڈ لیبر تھے لیکن اب وہ اسپیشل آفیسر وقف بورڈ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔



غلام دستگیر قریشی (آئی۔اے۔ایس)

سکریٹریٹ کے مقبول ترین، پسندیدہ اور ہمدرد اعلیٰ افسروں کا جہاں کہیں تذکرہ ہوگا، وہاں لازماً غلام دستگیر قریشی صاحب کا بھی ذکر آئے گا۔ سکریٹریٹ میں بعض ایسے نفیس اور با مروت اعلیٰ آفیسر بھی رہے ہیں جن سے گفتگو کرتے ہوئے بے حد خوشی محسوس ہوتی تھی۔ جناب نریندر لوتھر اور ڈاکٹر حسن الدین احمد کی طرح قریشی صاحب بھی سکریٹریٹ میں بہت کم رہے۔

قریشی صاحب سے میری پہلی ملاقات دکنی زبان کے ممتاز شاعر سلیمان خطیب کے ہمراہ اُس وقت ہوئی جب وہ اُن سے ملنے کے لئے سکریٹریٹ آئے تھے۔ خطیب صاحب پہلے میرے سکشن آئے اور اصرار کر کے اپنے ہمراہ قریشی صاحب کے

پاس لے گئے۔ اُن دنوں قریشی صاحب سکریٹری ریونیو ڈپارٹمنٹ و کمشنر محکمہ
بازآبادکاری تھے۔ خطیب صاحب نے پی۔ اے کے ذریعہ اپنا کارڈ بھجوایا۔
قریشی صاحب دروازہ تک آئے اور اچکن پہن کر اپنے ساتھ لے گئے۔ انھوں نے ہم
دونوں کی مشروبات سے تواضع کی۔ خطیب صاحب کی یہ عادت تھی کہ جب کبھی وہ
حیدرآباد آتے تو اپنے ہم عصر اور دوست احباب کی تلاش میں نکل جاتے۔ انھیں
قریشی صاحب سے کوئی خاص کام نہیں تھا، صرف ان سے ملنا مقصود تھا۔

قریشی صاحب سے میری دوسری ملاقات عالیہ اسکول کی گولڈن جوبلی
تقاریب کے موقع پر ہوئی۔ مشاعرہ میں اسکول کے اولڈ بوائز کی حیثیت سے
غلام احمد صاحب کرکیٹر اور قریشی صاحب نے بھی کلام سنایا تھا۔ اس مشاعرہ
کے بعد اُن سے مختلف محفلوں میں ملاقاتیں رہیں۔ قریشی صاحب میری شاعری
کے بھی مداح ہیں، جب بھی ملتے ہیں تو وہ میرے اشعار ضرور سناتے ہیں،
جو میں نے ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی کی خیر مقدمی تقریب میں سنائے تھے۔
(ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی جب صدر جمہوریہ ہند کے جلیل القدر عہدہ پر فائز ہوئے
تو شہریانِ حیدرآباد و سکندرآباد کی جانب سے پبلک گارڈن میں فقیدالمثال
خیر مقدمی جلسۂ عام کا انعقاد عمل میں لایا گیا تھا)۔ روابط کے تسلسل
اور مراسم کی تجدید کے لئے قریشی صاحب کو بعض ادبی محفلوں میں شرکت
کی دعوت دیا کرتا ہوں۔ سلجھے ہوئے اور شگفتہ لب و لہجہ سے آراستہ جب
ایسی شخصیتوں سے ملاقات ہوتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شہر کی تمام
نمائندہ شخصیتوں سے بیک ملاقات ہورہی ہے۔

نریندر لوتھر آئی۔ اے۔ ایس

آج سے تقریباً (۳۰) برس پہلے نریندر لوتھر صاحب سے میں اُس وقت روشناس ہوا جب پروفیسر عبدالقادر سروری کی رہائش گاہ (حیدرگوڑہ) پر ایک پُرتکلف عصرانہ ترتیب دیا گیا تھا، جس کے فوری بعد محفلِ شعر کا انعقاد عمل میں لایا جانے والا تھا۔ اس محفل میں مجھے لوتھر صاحب کی پہلی تصنیف 'بند کواڑ' کا رسم اجرا تقریب کا دعوت نامہ ملا تھا۔ یہ دعوت نامہ کتابوں کے سرورق کی طرح تھا (جو میرے پاس اب بھی محفوظ ہے)۔ اس کے بعد لوتھر صاحب سے مختلف جلسوں اور مشاعروں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد سے میری وابستگی کے بعد لوتھر صاحب سے ملنے کا موقع بار بار ملتا رہا۔ لوتھر صاحب سکریٹریٹ میں بہت کم عرصہ کے لئے رہے۔ اس لئے سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن ان کی خدمات سے استفادہ نہ کر سکی۔

لوتھر صاحب نہایت اصول پسند، ڈسپلن کے پابند اعلیٰ آفیسر رہے ہیں۔ ملازمت کے معاملے میں وہ انتہائی محتاط رویہ اختیار کرتے رہے۔ جس محکمہ میں لوتھر صاحب کارگذار رہے، وہاں انہوں نے اپنی ہر دل عزیزی اور اپنی شخصیت کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ چاہے وہ ڈائرکٹوریٹ انڈسٹریز ہو کہ ڈائرکٹوریٹ محکمہ اطلاعات عامہ، چاہے وہ میونسپل کارپوریشن ہو کہ میڈیکل اینڈ ہیلتھ ڈپارٹمنٹ (سکریٹریٹ) یا کوئی اور آفس ہو، وہ اپنی نفاست،

ذہانت اور اپنی صلاحیت کا لوہا منوا چکے ہیں۔

لوتھر صاحب ریٹائر ہونے سے کچھ دن قبل چیف سکریٹری کے اعلیٰ عہدہ پر بھی فائز رہے جنھوں نے چیف سکریٹری کے عہدہ کو شایانِ شان طریقہ پر نبھاتے ہوئے حکومت کے بعض اہم پروجکٹس کی صورت گری کے لئے نمایاں کام انجام دیا ہے۔ جس طرح وہ صفِ اول کے طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں، اسی طرح وہ اپنی ساری مدتِ ملازمت، باوقار، باصلاحیت اور قابل ترین اعلیٰ آفیسر کی حیثیت سے گذاری ہے۔ لوتھر صاحب ایک اعلیٰ درجہ کے آفیسر ہوتے ہوئے بھی شاعروں اور ادیبوں سے انتہائی سادگی اور روابط کی پاسداری کو محسوس کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ یقیناً لوتھر صاحب نے اپنی تمام مدتِ ملازمت کے دوران بہت سے مستحق ملازمین کے ساتھ انصاف کیا ہوگا۔ بہت سے دوست احباب کے لئے سفارشیں سُنی ہوں گی۔ سفارشیں کی ہوں گی۔

لوتھر صاحب نے ایک جنبشِ قلم سے میرے ایک ڈاکٹر دوست کے ساتھ بھی انصاف کیا۔ ایک دن یوں ہوا کہ ہندی کے ممتاز شاعر اوم پرکاش نرمل اپنے ایک ڈاکٹر دوست مسٹر وی۔ پی۔ سنگھی کو ہمراہ لے کر میرے سکشن میں آئے، چائے نوشی کے بعد مجھ سے کہا اتفاق سے لوتھر صاحب میڈیکل اینڈ ہیلت ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری ہیں، اُن سے کام لینا ہے۔ میرے یہ ڈاکٹر دوست تقریباً ۱½ سال سے رخصت پر ہیں۔ ان کا تبادلہ حیدرآباد پر ہونا بے حد ضروری ہے، چونکہ ان کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ ان کا شہر میں رہنا ضروری ہے۔

ہم دونوں ایک دن لوتھر صاحب سے ان کے اجلاس پر ملے۔ لوتھر صاحب نے

ہماری ساری باتیں سُنیں لیکن کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ البتہ اتنا ضرور کہا کہ اگر اصولی طور پر اعانت ممکن ہو تو میں ضرور مدد کروں گا۔ (محتاط رویہ کی یہ ایک معمولی سی مثال ہے) لیکن ہمیں یقین تھا کہ وہ ہماری سفارش کو رد نہیں کریں گے۔ کچھ دن گذرنے کے بعد ڈاکٹر سنگھی کا حیدرآباد پر تبادلہ ہو گیا۔ ہم دونوں ڈاکٹر سنگھی کو اپنے ہمراہ لے کر اظہار تشکر کے لئے لوتھر صاحب کے اجلاس پر پہنچے۔ لوتھر صاحب نے کہا کہ شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہر جائز کام میں اعانت کرتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا کہ بعض اعلیٰ عہدہ دار ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی بے پایاں کرم فرمائیوں کے باوجود بھی اپنی نیکیوں کا حساب نہیں رکھتے، ایسے ہی عہدہ داروں میں سے ایک آپ بھی ہیں۔



ڈاکٹر حسن الدین احمد آئی اے ایس

ڈاکٹر حسن الدین احمد مختصر عرصہ کے لئے سکریٹریٹ میں رہے۔ ان کی ملازمت کا زیادہ حصہ نان سکریٹریٹ سرویس اور مرکزی حکومت کے دفاتر میں گذرا۔ کئی برسوں سے میں ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے واقف ہوں۔ انہوں نے دوران ملازمت اپنی علمی و ادبی مصروفیات کو جاری رکھتے ہوئے کئی

کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ وظیفہ حسن خدمت کے بعد انہوں نے "انگریزی نظموں کے اُردو منظوم ترجموں کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد جب سکریٹریٹ کے محکمۂ فارسٹ، اینمل ہسبنڈری میں جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے مامور ہوئے تو مجھے اُن سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ شخصی حیثیت سے بھی اور سکریٹری سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی حیثیت سے بھی اُن سے ملنا ضروری سمجھا۔ میں سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی سرگرمیوں کے سلسلے میں اُن سے استفادہ حاصل کرنا ہی چاہ رہا تھا کہ موصوف کا تبادلہ ہوگیا اور وہ دلّی چلے گئے۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد بہت کم مدت کے لئے سکریٹریٹ میں رہے۔ اُن کے ماتحتین سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا جو اُن کے حُسنِ سلوک کے مداح تھے۔ خوش مزاجی، کم گوئی، حسن الدین احمد صاحب کے مزاج کا خاصہ ہے مزاج کے وہ بذلہ سنج واقع ہوئے ہیں۔ بات میں بات پیدا کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ کاش وہ بہت پہلے سکریٹریٹ میں آئے ہوتے۔ ایسی صورت میں سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے لئے اُن کی خدمات و مشاورت سے استفادہ حاصل کیا جاسکتا تھا ـــــ میں مختلف مواقع پر سکریٹریٹ کے اعلیٰ عہدہ داروں سے ملازمین سکریٹریٹ کی کارروائیوں اور اہلِ غرض حضرات کے کاموں کے لئے تعاون حاصل کیا کرتا تھا۔ حسن الدین احمد صاحب سے ایسا موقع مجھے نہ مل سکا۔ سکریٹریٹ کے اعلیٰ عہدہ دار جنھوں نے دورانِ ملازمت اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں اور اپنے تصنیف و تالیف کے کام کو جاری رکھا اُن میں

بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، رشید قریشی، سعد حسین سعد کے علاوہ ڈاکٹر حسن الدین احمد بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد سے میرے شخصی مراسم ہیں۔ علمی و ادبی محفلوں میں انہیں اظہارِ خیال کے لئے زحمت دیا کرتا ہوں۔ صدر نشین اقلیتی کمیشن ہونے کے بعد بھی وہ اپنی برادری (شاعروں اور ادیبوں) سے ملنے میں قطعی تکلف نہیں کرتے۔ حسن الدین احمد صاحب سے ملاقات کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن میں نہ صرف حیدرآبادی تہذیب کا تسلسل باقی ہے بلکہ اُن کے پیراہنِ خلوص میں ان کے اسلاف کی خوشبو بھی شامل ہے۔



خالد انصاری آئی اے ایس

جناب خالد انصاری سے، ایک وضع دار، مہذب اور شائستہ مزاج شخص کی حیثیت سے میرا تعارف ہوا۔ جناب مبشر احمد جوائنٹ سکریٹری فینانس ڈپارٹمنٹ اکثر ان کا ذکر کرتے ہوئے مجھے مشورہ دیتے تھے کہ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے پروگرامس میں ان کی صلاحیتوں سے بھی استفادہ کیا جاتا رہے تو بہتر ہے لیکن جب کبھی میں انہیں پروگرامس میں حصہ لینے کے لئے زحمت دینا چاہا وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس موقف

میں نہیں رہے کہ حصّہ لے سکیں۔

ایک دن میں ان کے اجلاس پر پہونچا جبکہ وہ محکمہ لیبر اینڈ ایمپلائمنٹ کے پرسنل سکریٹری تھے۔ بڑے پُرتپاک انداز سے مصافحہ کرنے کے بعد کہا کہ تشریف رکھئے۔ تقریباً نصف گھنٹہ تک اُردو کے مسائل اور اُردو شعر و ادب پر گفتگو رہی۔ دورانِ گفتگو اندازہ ہوا کہ مختلف علوم و فنون پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کے بارے میں میرا یہ تاثر ہے کہ قلندری ان کا اصلی جوہر ہے۔ نہایت صاف پسند اور بے باک انسان ہیں۔ ایسا تاثر لے کر میں ان کے اجلاس سے اُٹھا۔ خالد انصاری صاحب اگرچہ شیروانی زیب تن کئے ہوتے تھے لیکن ان کی شیروانی کے تمام بٹن ہمیشہ کھلے رہتے۔ وہ اپنی ایک خاص وضع داری پر قائم رہے۔

خالد انصاری صاحب کا انداز ہی الگ تھا، انہوں نے کبھی بھی اپنے طرزِ حیات کو نہیں بدلا۔ ایک وضع دار اور پُروقار شخصیت کی حیثیت سے سارے سکریٹریٹ پر چھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی اصول پسندی کو کسی بھی مرحلے پر قربان ہونے نہیں دیا۔ بے نیاز، قلندرانہ طبیعت کے مالک تھے۔ اپنے ایک خاص رنگ میں ڈوبے ہوئے، اپنی انفرادیت کو باقی رکھتے ہوئے، شاندار طریقہ سے وظیفہ حسن خدمت تک سکریٹریٹ کے وقار میں اضافہ کرتے رہے۔



اے۔ کے۔ گوئل آئی۔اے۔ ایس

سکریٹریٹ میں جو ان سال نئے آئی۔اے۔ایس عہدہ دار جو مختلف اوقات میں آتے رہے، اُن میں مسٹر اے کے گوئل کو بھی یاد رکھا جائے گا۔ اس اعتبار سے بھی کہ وہ نہ صرف ایک فرض شناس عہدہ دار تھے بلکہ وہ ایک انسانیت دوست، مروت شناس اور ہمدرد انسان بھی تھے۔

مسٹر اے۔کے۔گوئل سے میری پہلی ملاقات (۱۰) سال پہلے ورنگل کے ایک قومی یکجہتی مشاعرہ میں ہوئی تھی، جس کی انہوں نے صدارت کی تھی، مشاعرہ میں کلام سنایا تھا اور پُراثر تقریر بھی کی تھی۔ مشاعرہ کا اہتمام جناب جلیل امرت نے کیا تھا۔ گوئل صاحب کو شعر و ادب سے کافی لگاؤ ہے۔ ان کے اسلاف کا تعلق اُتر پردیش سے ہے۔ گوئل صاحب نے کلکٹر ورنگل کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ اُن سے میری دوسری ملاقات سکریٹریٹ میں ہوئی۔ جیسے ہی انہوں نے مجھے دیکھا بے ساختہ بغل گیر ہوئے اور کھل کر ہنستے ہوئے کہا کہ

کون قاتل ہے یہاں اپنے رفیقوں کے سوا
سب بھلے لوگ ہیں کس کس کو سزا دی جائے

گوئل صاحب نے کہا کہ میں اپنے محکمہ کے مختلف کیسس میں فیصلہ کرنے کے لئے آپ کے شعر سے مدد لیتا ہوں۔ میں نے مشاعرہ قومی یک جہتی کے موضوع پر کچھ شعر سناتے ہوئے یہ شعر بھی پڑھا تھا ؎

مطلع تھا
کیا ضروری ہے کہ شعلوں کو ہوا دی جائے
کیوں نہ اس شہر سے یہ رسم اٹھا دی جائے

جب گوئل صاحب جوائنٹ سکریٹری میونسپل ایڈمنسٹریشن کی حیثیت سے سکریٹریٹ جوائن کئے تو ان سے وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ نہایت دوستانہ ماحول میں گفتگو کیا کرتے تھے اور ہر دو تین جملوں کے بعد نیر بھائی ضرور کہتے۔ گوئل صاحب کے ادبی ذوق کو محسوس کرتے ہوئے انہیں سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے ریڈیائی پروگراموں میں حصہ لینے کی درخواست کرتا رہا۔ انھوں نے بھی ریڈیائی پروگراموں میں حصہ لیا ہے۔ گوئل صاحب ایک مخلص، صاف گو بے ریا انسان ہیں، جن سے ملنے کے بعد ہر شخص کی رگ و پے میں میری طرح مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہوگی۔ گوئل صاحب اگرچہ کہ اُتر پردیش کے رہنے والے ہیں لیکن انھوں نے حیدرآباد کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سارے ملک میں حیدرآباد ہی ایک ایسا محفوظ مقام ہے۔ جہاں ہر شہری اپنی فیملی کے ساتھ ذہنی سکون سے رہ سکتا ہے۔



وینکٹ رمناچاری آئی۔اے۔ایس

میں جناب وینکٹ رمناچاری کی سماجی، فلاحی، تہذیبی اور سیکولر سرگرمیوں سے اُس وقت سے واقف ہوں جبکہ وہ ایڈمنسٹریٹر قلی قطب شاہ

اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی حیثیت سے خاص طور پر پرانے شہر میں شہرت و مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ جب مجھے بعض پروگراموں کے سلسلے میں اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا تو میرے خیالات کی تصدیق ہو گئی۔ پتہ نہیں اُنہیں کس نے مشورہ دیا تھا کہ مشاعروں اور تہذیبی پروگرامس کے سلسلے میں مجھ سے تعاون حاصل کیا کریں۔

مسٹر رمنا چاری، قلی قطب شاہ آڈیٹوریم کے افتتاح کے موقع پر تہذیبی پروگرام کے ساتھ ساتھ مشاعرہ بھی منعقد کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن سکریٹری قلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی جناب تاج الدین نے فون پر بتایا کہ رمنا چاری صاحب مجھ سے فون پر بات کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ قلی قطب شاہ آڈیٹوریم کی افتتاحی تقریب کے موقع پر ایک شاندار مشاعرہ کا اہتمام کریں۔ رمنا چاری صاحب سے فون پر گفتگو رہی۔ جناب عابد علی خان مدیر سیاست کی صدارت میں شاندار پیمانے پر مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں تقریباً (۳۰) شاعروں نے کلام سنایا تھا۔ اُن تمام شاعروں کو قلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی جانب سے شال اوڑھائی جاکر سنمان کیا گیا۔

رمنا چاری صاحب سے میری دوسری ملاقات جشن گولکنڈہ سوسائٹی کے کل ہند مشاعرہ کے انتظامات کے سلسلے میں قلی قطب شاہ آڈیٹوریم میں ہوئی، اُس وقت جناب عابد علی خان صاحب، محبوب حسین جگر صاحب اور ڈاکٹر موہن لال نگم بھی موجود تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ انہیں حیدرآباد کی تہذیب اور اُردو زبان سے کافی دلچسپی ہے۔

جب رمناچاری صاحب ڈپٹی سکریٹری میونسپل ایڈمنسٹریشن کی حیثیت سے سکریٹریٹ آئے تو ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھنے لگا۔ اسی زمانے میں اولڈ سٹی یوتھ فسیٹول منعقد ہونے والا تھا۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی وائس چانسلر تلگو یونیورسٹی کے مشورہ سے مجھے یوتھ فسیٹول کا سکریٹری نامزد کیا گیا۔ میں نے ان کے اعتماد کو برقرار رکھتے ہوئے شب غزل اور مشاعرہ کے انعقاد کی ذمہ داری قبول کی۔ جناب خواجہ بہاء الدین اور جناب اسلم فرشوری شب غزل اور تہذیبی پروگرام کے کنوینر بنائے گئے۔ مسٹر نیہپال سنگھ ورما اور رئیس اختر کنوینر مشاعرہ اور ڈاکٹر صادق نقوی سیمینار کے کنوینر مقرر ہوئے۔ مشاعرہ میں اردو ہندی کے زائد از (۳۰) شاعروں نے کلام سنایا تھا۔ یہ گنگا جمنی مشاعرہ نہایت کامیاب رہا۔ مشاعرہ میں شعراء کو مومنٹو پیش کئے گئے اور تمام کے طور پر شال اوڑھائی گئی۔ میں نے لسانی ہم آہنگی کا ثبوت دیتے ہوئے اردو شاعروں کو دعوتِ سخن دینے کے لئے نیہپال سنگھ ورما کو اور ہندی شاعروں کو زحمتِ کلام دینے کے لئے رئیس اختر سے درخواست کی تھی۔ یہ گنگا جمنی مشاعرہ نہایت کامیاب رہا، مقصدی اعتبار سے بھی اور لسانی ہم آہنگی کے اعتبار سے بھی۔

مسٹر رمناچاری اردو شعر و ادب کی سرگرمیوں اور تہذیبی پروگراموں کے انعقاد کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ کیا کرتے ہیں۔ جب سے وہ ڈائرکٹر ہندی اور ... بن گئے ہیں ان کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ انہیں مجھ پر اس قدر اعتبار آگیا ہے کہ بعض پروگرامس میری ذمہ داری پر پہلے طے کرتے ہیں اور بعد میں مجھے اس کی اطلاع دیتے ہیں۔ ماہ مئی میں دلی میں محکمۂ تہذیبی امور ...

جانب سے ایک پروگرام طے کیا گیا اور یہاں سے (۱۸) فنکاروں کو دلی بھیجا گیا۔ پروگرام کے انچارج جناب خواجہ بہاء الدین تھے، اُن کی قیادت میں تمام فنکار دلی پہنچے اور شاندار و کامیاب پروگرام پیش کیا۔ اس پروگرام کی صورت گری میں جناب حمایت اللہ صاحب نے بھرپور تعاون کیا۔

رمنا چاری صاحب کی خواہش پر ادارہ "میرا شہر میرے لوگ" کے زیر اہتمام بہ تعاون محکمۂ تہذیبی اُمور و محکمۂ اطلاعات عامہ اعلیٰ پیمانے پر ماہ مئی ۱۹۹۱ء میں مال والا پیلس میں اُردو، ہندی کا ملا جُلا قومی یک جہتی مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس مشاعرہ میں سبھی شاعروں کا سنمان کیا جاکر شاعروں کو شال اوڑھائی گئی۔ اس مشاعرہ میں ۳۵ شاعروں نے کلام سنایا تھا۔

مسٹر رمنا چاری علاقہ تلنگانہ سے تعلق رکھنے والے ایک فرض شناس، دوست نواز اور باصلاحیت جواں سال عہدہ دار ہیں۔ محکمۂ تہذیبی اُمور کا جائزہ لینے کے بعد وہ بہتر سے بہتر پروگراموں کی پیش کشی کے لئے کوشاں ہیں۔ رمنا چاری صاحب سے میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ میں ان کے مزاج کی شائستگی، طبیعت کی نفاست اور ان کے مخلصانہ رویہ سے بے حد متاثر ہوں۔



ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی صدر نشین آفیشل لینگویج کمیشن

گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ پدم شری ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی (جو تلگو کے

عظیم شاعر ہیں) ۳ سال تک آفیشیل لینگویج کمیشن آندھرا پردیش کے صدر نشین رہے۔ ان سے پہلے مسٹر وندے ماترم چیرمین تھے۔ اس زمانے میں تلنگانہ کے ملازمین خاص طور پر مسلمان ملازمین تلگو نہ جاننے کی وجہ سے پریشان تھے۔ جب ڈاکٹر سی نارائن ریڈی نے اپنی خدمت کا جائزہ لیا تو انہوں نے آفیشیل لینگویج کی پالیسی کو متوازن بنا دیا۔ (وہ شدت نہیں رہی جو مسٹر وندے ماترم کے زمانے میں تھی)۔ ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی کا اجلاس اور میرا سکشن ایک ہی بلڈنگ میں واقع تھا۔ اکثر ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ جب کبھی ملازمین کے لئے تلگو میں مراسلت کا مسئلہ درپیش ہوتا۔ میں ان سے ملتا اور اس مسئلہ پر گفتگو رہتی۔ میں کہتا کہ تلنگانہ کے ملازمین اب دفاتر میں بہت کم رہ گئے ہیں جو تلگو لکھنے پڑھنے سے قطعی نابلد ہونے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ آپ تلگو مراسلت کے بارے میں نرم پالیسی اختیار کریں جیسا کہ آپ کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اس سلسلے میں میری مسلسل ملاقات اور گفتگو سے ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں کچھ مفید اور نئے گوشے ابھر کر آتے رہے (ویسے بھی وہ خود ایک معاملہ فہم انسان ہیں) انہوں نے کہا کہ جب میں کلکٹرس کی میٹنگ بلاتا ہوں یا اضلاع کے دورہ پر جاتا ہوں تو متعلقہ محکموں کے سربراہوں سے یہی کہتا ہوں کہ جنہیں تلگو آتی ہے وہ تلگو میں مراسلت کریں۔ اور جنہیں تلگو نہیں آتی انہیں مجبور نہ کیا جائے بلکہ انہیں تلگو لکھنے پڑھنے کی ترغیب دی جائے۔ اور ایسے ملازمین جن کی عمر ۴۵ سال سے متجاوز ہوگئی ہے اور وہ جو وظیفہ کے قریب ہیں انہیں مستثنیٰ رکھا جائے۔ ڈاکٹر ریڈی کی صدر نشینی کا دور نہایت پُرسکون رہا۔ پھر وہ اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے۔

(ان دنوں تلگو یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں)۔ ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی کا سے میرے
دیرینہ روابط ہیں اردو سے عربی میں مجھ سے مشورہ سخن کیا کرتے ہیں۔ اُن سے
میری پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جب کہ وہ صدر جمہوریہ ہند مسٹر نیلم سنجیوا ریڈی
کے تہنیتی جلسے میں جو پبلک گارڈن میں (اُن کے صدر جمہوریہ ہند بننے کے بعد
شہریانِ حیدرآباد و سکندرآباد کی جانب سے) منعقد ہوا تھا، نظم سنانے کے
لئے آئے تھے۔ حُسنِ اتفاق سے اردو شاعروں میں مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا
تھا۔ (میرے نام کی تجویز نواب میر احمد علی خاں وزیر داخلہ حکومت آندھرا پردیش
نے کی تھی)، پھر ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی سے سرکاری اور عوامی مشاعروں
میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اُن سے میرے تقریباً (۲۰) سالہ دوستانہ روابط ہیں۔
جب کبھی اردو شعر و ادب سے متعلق کوئی بات دریافت طلب ہو تو مجھ سے ربط
پیدا کرتے ہیں اور کبھی تو وہ موٹر بھیج کر اپنے گھر پر بلاتے ہیں اور کبھی تلگو
یونیورسٹی پر یاد فرماتے ہیں۔ یہ سلسلہ استواری کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔
ڈاکٹر ریڈی ایک سچے فنکار اور کھلے دل و دماغ کے انسان ہیں۔ شنکر جی
کُل ہند مشاعرہ، زندہ دلانِ حیدرآباد کے کل ہند مشاعرہ اور سدبھاؤنا کے مشاعرہ
میں اس اعلان کے ساتھ انہوں نے اپنی اردو نظم سُنائی کہ اس نظم پر میں نے
اپنے شاعر دوست نیّر صاحب سے اصلاح لی ہے۔ اِس طرح وہ اپنی شرافتِ
نفس کا ثبوت دیتے ہوئے ہزاروں لوگوں میں مجھ سے خلوصِ دل کے ساتھ
اپنی وابستگی کا اعلان کرتے ہیں۔ تلگو یونیورسٹی میں ڈاکٹر صاحب کی شخصی
دلچسپی کی وجہ سے عنقریب اُردو اور ہندی ایم۔ اے کی تعلیم کا انتظام کیا

جارہا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بورڈ آف اسٹڈیز کی تشکیل عمل میں آئی ہے جس میں پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر ڈی۔ راما نج راؤ، ڈاکٹر عابد علی خان کے علاوہ میں بھی شامل ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے رکن بنانے کے بعد فون پر مجھے اطلاع دی۔ اور کہا کہ ایم۔ اے اردو کورس کی تیاری و تدوین کے لئے ہم نے آپ کا نام بورڈ آف گورنرس میں خصوصیت کے ساتھ رکھا ہے۔ جب میں نے ڈاکٹر ریڈی سے یہ پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب! میں نہ تو کسی کالج کا لکچرر ہوں اور نہ ہی کسی یونیورسٹی کا ڈاکٹر یا پروفیسر تو پھر آپ نے مجھے کیوں بورڈ آف گورنرس میں شامل کیا تو ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ جب ایک شاعر پر یونیورسٹیز میں ریسرچ ہو سکتا ہے تو کیوں نہ اس کی صلاحیت سے تعلیمی امور میں بھی استفادہ حاصل کیا جائے، میں نے ایک شاعر کو شامل کرکے پرانی روایت توڑ دی ہے



آر۔ نرسمہا راؤ اور وینکٹ رامیا

اکونٹس آفیسر

میری سکریٹریٹ کی ملازمت کی تقریباً تمام مدت اکونٹس سکشن میں گذری شروع سے آخر تک میں پنچایت راج ڈپارٹمنٹ میں رہا۔ مسٹر راج گوپال، سی جے راما جوگا راؤ، جی کے نارائن راؤ، سبرامنیم شاستری کے علاوہ کچھ اور اکونٹس آفیسرس بھی میرے سکشن کے انچارج رہے لیکن آر۔ نرسمہا راؤ اور وینکٹ رامیا صاحب

نبھانا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ یہ دونوں کافی عرصے تک میرے سکشن کے انچارج رہے۔ ان دونوں عہدہ داروں سے میری اچھی خاصی دوستی تھی۔ اکاؤنٹس آفیسر بننے سے پہلے یہ دونوں سکشن آفیسر تھے (لیکن مجھ سے سینئر تھے) جب یہ دونوں مختلف اوقات میں اکونٹس آفیسر کے عہدہ پر مامور ہوئے تو انہوں نے کبھی یہ محسوس ہی ہونے نہیں دیا کہ وہ میرے آفیسر ہیں۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ آندھرا کے بہت سے آفیسر میری شاعرانہ پوزیشن اور تلنگانہ کے بیشتر اعلیٰ عہدیداروں سے میرے مراسم کی وجہ سے بھی میری عزت کرتے تھے۔ ان دونوں آفیسرس کے زمانے میں مجھے ہر ممکنہ سہولتیں فراہم کیں۔ انہوں نے کبھی بھی مجھے رخصت پر آنے یا دفتر کے اوقات کے بعد کام کرنے کے لئے نہیں کہا۔ البتہ میرے ساتھی سکشن آفیسر جی۔ پربھاکر راؤ میرے ذمہ کا کام بھی میٹنگس کے دوران دیکھ لیتے تھے (چونکہ کام کی نوعیت کے لحاظ سے اکونٹس سکشن VII اور کونسلس ان VIII کا کام مشترکہ طور پر انجام پاتا تھا)۔ علاقہ آندھرا کے تمام اضلاع مجھ سے متعلق تھے اور علاقہ تلنگانہ کے تمام اضلاع مسٹر پربھاکر سے متعلق تھے میری سکشن آفیسری کے زمانے میں جن آڈیٹرس نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا اُن میں سے کچھ نام یہ ہیں، مسز زین۔ دتاتریہ، بھگوان داس، عائشہ سلطانہ، محمد یعقوب جیا لکشمی، غلام غوث، یادگیری، محمد یونس، سدرشن، پرکاش راؤ، وائی پربھاکر راجو، جی۔ ستیہ نارائنا، نگیندر راؤ، این۔ وی۔ ناگ راج، کے۔ سی۔ ایچ۔ ستیالو، نیوڈا ساہما۔ ای۔ وینکٹیشور راؤ، پرکاش راؤ، جی۔ دشرتن اور سری رام چندر مورتی۔ ان آڈیٹرز نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ میں نے تعاون کے جواب

میں اپنی ذمہ داری پر اُن سے ہر ممکنہ رعائتیں کیں ۔ میں اپنے ایک اور ساتھی سکشن آفیسر کرشنپا کرن (اکونٹس ۱۱۷) سے بھی ضرورتاً کبھی کبھی تعاون حاصل کرتا تھا۔ مسٹر ارجن راؤ سکشن آفیسر اکونٹس ۱۱۷ بھی میرے رفیق کار رہے ہیں۔

میرا سکشن بنیادی طور پر ٹور سکشن تھا لیکن کبھی بھی مجھے ٹور پر جانے کے لئے مجبور نہیں کیا گیا۔ یہ آفیسرس جانتے تھے کہ میں شہر کی مختلف ادبی و تہذیبی انجمنوں سے وابستہ ہوں، اس لئے شہر نہیں چھوڑ سکتا۔ آفس کا کام دوستانہ ماحول میں کیا جاتا تھا۔ میں ان کے دور میں جس وقت بھی چاہتا ہوں اجازت لے کر یا فون پر اطلاع دے کر سکریٹریٹ سے نکل جاتا تھا۔ رخصتوں کے معاملے میں کبھی بھی وہ رکاوٹ نہیں بنتے تھے۔ ویسے میں نے بہت کم رخصتیں لی ہیں۔ میں اپنے سکشن میں اپنا سارا ادبی کام نہایت اطمینان کے ساتھ انجام دیتا تھا۔ کسی آفیسر نے بھی یہ نہیں پوچھا کہ سرکاری آفس میں ادبی کام کا کیا جواز ہوسکتا ہے۔ میرے ایک ساتھی مسٹر پی۔ آر۔ سی۔ پدماکر جو صیغہ انتظامی (ادبی ۲) کے سکشن آفیسر تھے میرے سکشن میں ٹیلی فون نصب کروایا۔ جس سے مجھے بے حد سہولت رہی۔ دفتری اوقات میں اِدھر اُدھر گھومنے کے بجائے میں اپنی سیٹ پر بیٹھا رہتا۔ اپنے سرکاری کام کی یکسوئی کے بعد اپنے ادبی کام کو جاری رکھتا۔ میری میز پر ہمیشہ اُردو کتابیں اور اُردو رسائل رہتے۔ انسپکشن کے دوران کبھی کسی آفیسر نے اعتراض نہیں کیا کہ آفس میں اُردو لکھنے پڑھنے کا کیا مطلب ہے۔ محکمہ پنچایت راج کے بیشتر اعلیٰ عہدہ دار میری عزت کرتے تھے۔ آفس کے تمام ساتھی بہترین

دوستوں کی طرح مجھ سے ملتے رہے، یوں محسوس ہوتا کہ ہم سب ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

سکریٹریٹ کے عہدہ داروں سے ہٹ کر مختلف محکموں کے جن عہدیداروں نے میری سفارش کی پذیرائی کی، ان میں مرزا سرفراز علی ڈی ای او عبدالوحید خاں ناظم آثارِ قدیمہ، اسد اللہ سعید آئی اے ایس ناظم بندوبست، قادر علی خاں آئی اے ایس، عبدالحسین آئی اے ایس کے علاوہ ڈاکٹر موہن لال نگم بھی قابلِ ذکر ہیں۔

میں نے اپنی ساری ملازمت کے دوران نہ تو رشوت لی اور نہ ہی کسی قسم کے تحفے قبول کئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں آج معاشی طور پر مطمئن رہنے کے علاوہ معاشرہ کی نگاہوں میں ذلیل نہیں ہوں۔ زندگی کے کسی مرحلہ پر بھی میں نے اپنے وقار اور طریقہ کو داغدار ہونے نہیں دیا۔ دورانِ ملازمت خدا کا شکر ہے کہ میں نے بے شمار لوگوں کی مدد کی ہے، سینکڑوں ضرورت مند لوگوں کے سرٹیفکیٹس اور ضروری کاغذات پر گزیٹیڈ آفیسر کی حیثیت سے دستخط کئے اور بلا تامل اللہ کے نام پر بڑی بڑی ذمہ داریاں قبول کیں۔ سینکڑوں ملازمین کے وظائف کے فارم پر تصدیقی دستخط کے علاوہ خاص طور پر مکانات کے ضروری دستاویزات پر بلا تخصیص مذہب و ملت دستخط کئے۔ جو شخص بھی اپنے کام کے لئے مجھ سے ملنے سکریٹریٹ آتا اُسے مایوسی نہیں ہوتی تھی۔



سکریٹریٹ کے عہدہ داروں سے مراسم

دورانِ ملازمت جن اعلیٰ عہدہ داروں سے میرے مراسم رہے اور جنھوں نے مختلف اہلِ غرض اصحاب کی کارروائیوں کے سلسلے میں مجھ سے تعاون کیا اُن میں سے کچھ نام یہ ہیں۔

مسز ایس۔ اے۔ قادر آئی اے ایس، ایڈیشنل چیف سکریٹری، رائے کنج بہاری لال آئی۔ اے۔ ایس، ایڈیشنل چیف سکریٹری، بھارت چند کھنہ آئی اے ایس، سید ہاشم علی اختر آئی اے ایس، غلام دستگیر قریشی آئی اے ایس، ہاشم علی خاں آئی اے ایس، خالد انصاری آئی اے ایس، گرو داس آئی اے ایس، غلام جیلانی آئی اے ایس، نریندر لوتھر آئی اے ایس، این کے سیٹھو آئی اے ایس، محمد تاج الدین آئی اے ایس، بی این واگھرے آئی اے ایس، محسن بن شبیر آئی اے ایس، اسد اللہ سعید آئی اے ایس، رمن راؤ آئی۔ اے ایس، ایم اے حلیم آئی اے ایس، اے کے گوئل آئی اے ایس، ڈاکٹر حسن الدین احمد آئی اے ایس، شیخ مولیٰ آئی اے ایس، سید تراب الحسن آئی اے ایس، سعد حسین سعد آئی اے ایس، مہاراج کرن آئی اے ایس، راجن خواجہ آئی اے ایس، غلام احمد، رشید قریشی، مبشر احمد، خواجہ حمید احمد، عبدالمحمود، یس اے عزیز، کرشنا مورتی، محمد سعید خواجہ معین الدین، کے۔ پچیا، مسٹر پچوانی آئی اے ایس، اور بھیم راؤ آئی اے ایس وغیرہ۔

سکریٹریٹ کے میرے ساتھی

سید افضل حسین ، خواجہ بہار الدین ، محمد علیم الدین ، محمد غوری ، سید محمد قادری ، عبدالرحیم ، علی عابدی ، ہنبجیت سنگھ ملک ، پربھاکر راؤ ، کشٹپا کرن ، ارجن راؤ ، بی۔ این۔ واگھرے ، علی نواز خاں ، نرسمہا ریڈی ، آدی نارائن کے سی پربھو ، نظام الدین ، سید جعفر ، عباس ہاشمی ، بشیر انور ، راج گوپال ، ڈاکٹر منیرالزماں نیر ، شکیل احمد ، سلیم خاں ، تحسین حسین ، محمود علی ، یم۔ راج لنگم ، حبیب محمودی ، حبیب الدین ، شیخ لطیف ، ہنمنت راؤ ، منوہر راؤ ، غازی الدین احمد مجید صدیقی ، حبیب احمد ، مبشر احمد ، برہمن ، روی ، فائق احمد ، برکت اللہ خاں احمد محی الدین ، ایشوری پرشاد سنگھی ، محمد قاسم ، شیخ میراں ، پی سی تپا ، بدیع الدین ، عبدالوہاب ، رگھو راج ، راجہ راؤ ، محمد قدوس ، نظام الدین ، محمد قمر الدین ، چاند پاشاہ ، او۔ یادگیری ، نثار مہدی علی خاں طالب وغیرہ

سکریٹریٹ کے تین اور اہم نام

سکریٹریٹ کے ساتھیوں میں اگر چیکہ بہت سے نام میرے مخصوص اور غیر مخصوص احباب کی فہرست میں کہیں نہ کہیں اپنا عکس چھوڑ گئے ہیں۔ مختلف وجوہات کی بناء پر سکریٹریٹ کے ساتھیوں میں تین نام میرے لئے

ناقابل فراموش ہیں۔ پہلا نام سید افضل حسین سکشن آفیسر ہوم ڈپارٹمنٹ کا ہے، دوسرا نام الحاج خواجہ بہاء الدین سکشن آفیسر (موظف) کا اور تیسرا نام الحاج محمد علیم الدین اسسٹنٹ سکریٹری (موظف کا ہے) یہ تینوں نام اپنی اپنی خصوصیات کی وجہ سے پہلے نمبر پر ہی ہیں۔



○ سید افضل حسین میری ابتدائی ملازمت کے زمانے سے اختتام ملازمت تک دھوپ چھاؤں کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ رہے ہیں۔ ایک معتبر اور کھرے انسان کی طرح اپنی زندگی کے ہر لحاظ پر فاتحانہ انداز سے گذرنے والے افضل حسین کی طبیعت میں آج بھی وہی بانکپن، وہی خودداری، وہی انا اور وہی بھرپور خلوص ہے، جو پہلے تھا۔ دل کی باتیں ہوں کہ دماغ کی باتیں، میری کون سی ایسی بات ہوگی جو افضل حسین سے پوشیدہ رہی ہو۔ جن دوستوں پر میں تاحیات فخر محسوس کرتا رہوں گا ان میں افضل حسین کا نام سرفہرست رہے گا۔



○ الحاج خواجہ بہاء الدین ایک بہترین دوست کی طرح ابتدائی ملاقات سے آج تک سایہ کی طرح میرے ساتھ ہیں۔ میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں خواجہ بہاء الدین، افضل حسین، محمد علیم الدین، بی۔ این۔ داگھرے، خواجہ معین الدین (جوائنٹ سکریٹری) اور علی نواز خاں نے نہ صرف میری شاعرانہ صلاحیتوں کو سراہا بلکہ میرے بہترین مستقبل کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کرتے رہے

خواجہ بہاء الدین نے اس طویل عرصہ میں ریڈیو، ٹی وی اور اسٹیج پروگراموں میں میری غزلیں، نظمیں جتنی تعداد میں پیش کی ہیں، کسی اور شاعر کی پیش نہیں کیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میری موجودہ شاعرانہ پوزیشن کے تعین میں اور میری شاعری کے ابتدائی زمانے کے معاونین میں خواجہ بہاء الدین بھی ہیں۔ بعض دفعہ میرے لئے یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ بہاء الدین میرے دوست ہیں کہ بھائی۔ سیدھے سادے اور محبت شناس لوگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔



الحاج محمد علیم الدین سکریٹریٹ کی تاریخ میں ایک نیک سیرت، خوش گفتار، پاکباز اور صاف ستھری شخصیت کی حیثیت سے یاد کئے جائیں گے، جن کی دوستی کی وجہ سے ہم جیسے قلندر صفات دوستوں کا بھی بھلا ہوتا رہتا ہے۔ علیم صاحب نے سکریٹریٹ میں بے شمار لوگوں کی بلاتخصیص مذہب و ذات مدد کی ہے۔ نہایت نیک، پابند صوم وصلوٰۃ انسان ہیں۔ ان کے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ گذشتہ ۳۰ برسوں میں شائد ہی اُن کی کوئی نماز قضاء ہوئی ہو۔ ہم تمام دوست علیم صاحب کی نیکیوں کی بدولت دنیوی آلائشوں سے محفوظ رہے ہیں۔ سکریٹریٹ میں کام کرنے والے پُرخلوص احباب کے تذکرہ میں علیم صاحب کا نام بھی ایک ہمدرد انسان اور بہترین دوست کی طرح ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔



متاثر ہوئے کہ جیسے ہی میں نظم سناکر شہ نشین سے اُتر رہا تھا اُنہوں نے اپنے پاس بلاکر اولاً نظم کی تعریف کی اور کہا کہ اس نظم کی ایک کاپی مجھے دیدیجئے میں نے کہا کہ میں آفس آکر دے دوں گا۔ انہوں نے تاکیداً یہ بھی کہا کہ آپ ضرور مل لیں۔ میں آپ کی اعانت کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں اُن سے سکریٹریٹ میں ملا تو انہوں نے مجموعے کی اشاعت کے لئے درخواست دینے کے لئے کہا۔ میں نے اپنے مجموعۂ کلام 'زخموں کے گلاب' کی اشاعت کے لئے درخواست دی۔ مجھے گرانٹ مل گئی اور کتاب شائع ہو گئی۔



جناب ٹی۔ انجیا چیف منسٹر اور ملک الشعرا اوج یعقوبی

جس زمانے میں مسٹر ٹی۔ انجیا آندھرا پردیش کے چیف منسٹر تھے تو اُن دنوں اُن کی صدارت میں زیر اہتمام کل ہند مجلس اتحاد المسلمین دیوڑھی خورشید جاہ (شاہ گنج) میں کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرہ میں، میں نے بھی کلام سنایا تھا۔ غزل کے اس مطلع

اِس بھری بزم میں پھر ماتم تنہائی ہے
کس نے مقتل سے پھر اک لاش اٹھالائی ہے

کے بعد جب میں نے یہ شعر سہ

جب تلک ہم نہ لُٹے ہم کو یہ اندازہ نہ تھا
قاتلِ شہر کی کس کس سے شناسائی ہے

سُنایا تو جناب سلطان صلاح الدین اویسی نے چیف منسٹر صاحب سے یہ کہا تھا کہ یہ شعر آپ کے لئے نہیں، سابقہ چیف منسٹر کے لئے ہے۔ اس مشاعرہ میں چیف منسٹر صاحب نے ممتاز شاعر جناب اوج یعقوبی کو ملک الشعراء کا اعزاز دیئے جانے کا اعلان کیا۔ جناب صلاح الدین اویسی نے چیف منسٹر سے سفارش کی تھی۔ درخواست کچھ دنوں تک چیف منسٹر کی پیشی میں رکھی ہوئی تھی۔ میں نے متعلقہ محکمہ کو ضروری کارروائی کے لئے بھجوائی۔ اُس زمانے میں کچھ شعراء نے اس اعلان کے خلاف چیف منسٹر صاحب سے نمائندگی کی تھی اور بعض اصحاب نے تحریراً اس اعلان کو منسوخ کرنے کی درخواست کی تھی لیکن یہ تجاویز اور درخواستیں داخلِ دفتر کر دی گئیں۔ اُن دنوں اوج یعقوبی صاحب نا اُمیدی اور غیر یقینی حالات کا شکار ہو گئے تھے۔ اُن کے خیال میں عوامی دورِ حکومت میں کوئی بھی فیصلہ کبھی بھی صادر ہو سکتا ہے اور کبھی بھی بدلا جا سکتا ہے۔ مجھ سے اوج صاحب سکریٹریٹ میں ملتے رہے۔ محکمۂ تعلیمات کے سکشن آفیسر جن کا تعلق علاقہ آندھرا سے تھا، اُن سے میرا مسلسل ربط تھا۔ کارروائی کی پیش رفت کے لئے اویسی صاحب کی سفارشی درخواست کا ترجمہ ضروری تھا، جس کی ذمہ داری میں نے لی، چونکہ سکشن آفیسر اُردو زبان سے قطعی نابلد تھے۔ اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے بعد میں نے ترجمہ کی صحت پر بحیثیت گزیٹیڈ آفیسر دستخط کئے۔ میری دستخط کے بعد کارروائی حرکت میں آگئی۔ آفس کے اوقات کے بعد بھی۔ اوپر

سکشن آفیسر کی دستخط حاصل کی گئی۔ جی۔او جاری ہوا۔ اخبارات میں اوج یعقوبی صاحب کے ملک الشعراء ہونے کی خبر شائع کروائی گئی۔ اس طرح یہ بڑا مرحلہ جس کے لئے رکاوٹیں پیدا کی جارہی تھیں بہ حسن وخوبی طے ہوگیا۔ اوج یعقوبی صاحب کا ملک الشعراء بننے کے کچھ ہی عرصہ بعد انتقال ہوگیا۔



کالج آف اورینٹل لینگویجس کی گرانٹ

کالج آف اورینٹل لینگویجس کے پرنسپل ہاشم حسن سعید میرے بہترین دوستوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے کالج کی گرانٹ بند ہوچکی تھی۔ (تقریباً ۴ سال سے گرانٹ نہیں مل رہی تھی) متعلقہ فائیل محکمۂ تعلیمات میں شریک ریکارڈ کی جاچکی تھی۔ یہ فائیل ہاشم حسن سعید کی مسلسل پیروی اور میرے مکمل تعاون سے حرکت میں آگئی۔ محکمۂ تعلیمات کے ڈپٹی سکریٹری مسٹر کرشنا مورتی اور محکمۂ فینانس کے سکشن آفیسر مسٹر تحسین حسن کی شخصی دلچسپی اور بے لوث تعاون کی وجہ سے کارروائی میں جان پڑگئی اور گرانٹ جاری ہوئی۔ ہاشم حسن سعید جب بھی اس کارروائی کے سلسلے میں سکریٹریٹ آتے تو پہلے میرے پاس آتے، پھر ہم دونوں کا سفر جاری رہتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہاشم حسن سعید نے اس کالج کی گرانٹ کے لئے اپنا بہت زیادہ وقت دیا۔ اگر وہ اس کارروائی کے لئے کوشاں نہ رہتے تو شائد بہت سی مشکلات پیش آتیں۔

المدینہ کالج آف ایجوکیشن محبوب نگر

مسٹر این. بھاسکر راؤ کی چیف منسٹری کا زمانہ تھا (جن کی حکومت مشکل سے ۲ ماہ رہی)۔ اُن کے دور حکومت میں مسلم اقلیتی اداروں کے بہت سے اہم کام ہوئے۔ اُن ہی کے زمانے میں دکن میڈیکل کالج کی اجازت ملی۔ المدینہ کالج آف ایجوکیشن محبوب نگر (مسلم اقلیتی انسٹی ٹیوشن) کے قیام کی منظوری ملی۔ اس کالج کے قیام کی اجازت میں میری مسلسل کوششوں کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ کالج کے قیام کی اجازت کے لئے جناب شفیع العلی (سکریٹری)، جناب مسعود علی فاروقی ایڈوکیٹ (صدر)، جناب کاری (رکن) اور جناب خواجہ قطب الدین پیروی کیا کرتے تھے۔ بہت سی محکمہ جاتی رکاوٹیں حائل تھیں۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ محکمۂ تعلیمات کی عمارت کے ایک کارنر پر درخت کے نیچے یہ حضرات کھڑے ہوئے ہیں۔ محبوب نگر کے مشاعروں کے سلسلہ میں ان حضرات سے میری جان پہچان تھی۔ میں نے سکریٹریٹ آنے کی وجہ پوچھی اور انہیں اپنے سکشن لے گیا۔ اس ملاقات کے بعد میں نے ان اصحاب کی خواہش پر کاروائی میں دلچسپی لی۔ یہ سلسلہ تقریباً چھ ماہ تک چلتا رہا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد جب کبھی یہ اصحاب سکریٹریٹ آتے تو پہلے میرے پاس آتے، پھر فائیل کا پوزیشن جاننے کے لئے محکمۂ تعلیمات اور فینانس کے چکر کاٹتے۔ اس سلسلے میں مسٹر کرشنا مورتی ڈپٹی سکریٹری محکمۂ تعلیمات نے (جو

جیسے محکمہ کے ساتھی دوست اور علاقہ تلنگانہ (حیدرآباد) سے تعلق رکھتے تھے، غیر معمولی دلچسپی لی۔ ان ہی کی کوشش اور تعاون کی وجہ سے کالج کے قیام کی اجازت کی ساری رکاوٹیں دور ہوتی گئیں۔ اس سلسلے میں فینانس ڈپارٹمنٹ کے سکشن آفیسر تحسین حسین نے بھی مکمل تعاون کیا۔ مسٹر این بھاسکر راؤ چیف منسٹر کی حکومت کے خاتمہ سے ۳، ۴ دن پہلے بہت سے اصحاب نے اپنی اپنی کارروائیوں کی یکسوئی کرلی۔ المدینہ کالج آف ایجوکیشن کی فائیل چیف منسٹر کی دستخط کے بعد محکمۂ تعلیمات میں پہونچی۔ این بھاسکر راؤ کی چیف منسٹری شائد صرف ایک دن یا دو دن باقی رہ گئی تھی۔ ایسے غیر یقینی حالات میں، میں نے تعلیمات کے متعلقہ ڈپٹی سکریٹری، اسسٹنٹ سکریٹری، سکشن آفیسر اور دیگر اسٹاف کے تعاون سے قریب ۸ بجے شب جی۔ او پر دستخط حاصل کئے۔ جی۔ او جاری ہوا۔ اخبارات میں خبر چھپوائی۔ آل انڈیا ریڈیو کی علاقائی خبروں میں کالج کے قیام کی منظوری کا اعلان کروایا گیا۔ اگر اس جی او کی اجرائی میں تاخیر ہوتی تو اس کالج کے قیام میں شائد کچھ اور وقت لگ جاتا۔



ہندی اکیڈیمی

جب راجکماری اندرا دھن راج گیر جی صدر نشین ہندی اکیڈیمی اور ہندی کے ممتاز شاعر جناب اوم پرکاش ترمل ، سکریٹری تھے ' ان دونوں سے سکریٹریٹ

میں ملاقات ہوئی جو ہندی اکیڈیمی کی گرانٹ کی منظوری کے سلسلے میں سکریٹریٹ آئے تھے۔ ویسے ہندی اکیڈیمی کی تشکیلِ جدید کے سلسلے میں ان دونوں سے فون پر گفتگو ہوا کرتی تھی اور میں اُنہیں کارروائی کی نوعیت اور اس کی پیش رفت کے بارے میں اطلاع دیتا رہتا تھا۔ جس زمانے میں منظوری کا مسئلہ اُلجھا ہوا تھا۔ اُس زمانے میں نرمل جی کا سکریٹریٹ آنا گویا معمول سا ہوگیا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر سکریٹریٹ آتے۔ سکریٹریٹ میں ان کے دائرہ اور ان کی نشست کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں اپنے سکشن میں رہوں یا نہ رہوں اُن کے لئے ایک زائد کرسی موجود رہتی۔ اُن کا آنا جانا کچھ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ سکریٹریٹ کے بعض ملازمین خاص طور پر ریسپشن سکشن کے ذمہ داران اُنہیں سکریٹریٹ کا ہی ایک عہدہ دار سمجھنے لگے۔ نرمل جی بلا جھجھک سکریٹریٹ آتے، جیسے ہی وہ سکریٹریٹ میں داخل ہوتے سیدھے میرے پاس آجاتے۔ ہم دونوں کافی باوز چلے جاتے۔ چائے، سگریٹ نوشی کے بعد کبھی تو مسٹر کرشنا مورتی ڈپٹی سکریٹری محکمۂ تعلیمات کے پاس جاتے اور کبھی تحسین صاحب سکشن آفیسر فینانس ڈپارٹمنٹ کے پاس جاتے۔ ان دونوں کے پاس اُردو، ہندی اکیڈیمیوں کے علاوہ اور کئی علمی و ادبی اداروں کی گرانٹس کی کارروائیاں بھی زیرِ دوران رہتی تھیں اور دونوں نہایت دلچسپی سے کارروائی کی یکسوئی تک مکمل تعاون کرتے تھے۔ حسنِ اتفاق سے یہ دونوں میرے بہترین دوست تھے۔ مسٹر کرشنا مورتی اور جناب تحسین حسین کی شخصی دلچسپی کی وجہ سے ہندی اکیڈیمی کی نوے فیصد کارروائی تکمیل کو پہنچ گئی تھی، اور ہماری مسلسل کوششوں سے گرانٹ منظور ہوئی۔ میرے اس تعاون سے ہندی کے ادبی حلقوں میں میری بڑی پذیرائی ہوئی۔

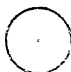
اِدارۂ ادبیاتِ اُردو

جب میں نے علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا تو مجھے اس بات کی خواہش تھی کہ علومِ مشرقیہ کے تمام امتحانات کامیاب کروں۔ چنانچہ میں نے ایک دن ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا رُخ کیا اور وہاں ادارہ کے منتظم جمال الدین صاحب سے ملا اور اُن سے میں نے ادارہ کے امتحانات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ میں نے ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے اُردو عالم اور اُردو فاضل کے امتحانات اچھے نمبرات کے ساتھ کامیاب کئے، اُردو فاضل کی اساس پر میں نے جامعہ اُردو علی گڑھ کا امتحان ادیب کامل بہ درجۂ اول کامیاب کیا۔ جامعہ نظامیہ حیدرآباد سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔ اس طرح میں نے علومِ مشرقیہ کی اہم ڈگریاں حاصل کیں۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں کسی کالج میں شریک ہو جاؤں اور پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہوں (چونکہ میں گورنمنٹ سروس میں تھا اس لئے عثمانیہ یونیورسٹی میں شرکت ممکن نہ ہوسکی)۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ایسے طالب علم جو ادیب کامل کامیاب ہوں، جامعہ عثمانیہ کے امتحان بی۔ او۔ ایل میں شریک ہو سکتے ہیں تو میں نے اُردو ایوننگ کالج، حمایت نگر میں ۱۹۵۹ء میں داخلہ لیا۔ بی۔ او۔ ایل کامیاب کرنے کے بعد میں نے ایم۔ او۔ ایل (مساوی ایم۔ اے، اُردو) کامیاب کیا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کی ایک سالانہ تقریب کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے مجھے ادارۂ ادبیاتِ اُردو بُلایا اور مجھ سے خواہش کی کہ میں مخدوم محی الدین صاحب کی مشہور نظم "بھاگ متی" ترنم سے سُناؤں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے ترنم میں نظم سنی تو انہیں ترنم پسند آیا، اور پھر ان کی خواہش پر میں نے وہ نظم 'یوم محمد قلی قطب شاہ' کے افتتاحیہ اجلاس (جو احاطہ گنبد محمد قلی قطب شاہ منعقد ہوا تھا) میں سنائی۔ ایک دفعہ ڈاکٹر زورؔ نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا تھا کہ بی۔او۔ال اچھے نمبرات کے ساتھ پاس کرلو، میں تمہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھیج دوں گا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ خصوصیت تھی کہ ہر اُس نوجوان کو جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ ترقی کرسکتا ہے اُس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حیدرآباد کے بے شمار نوجوانوں کو ادارہ کے مختلف شعبوں سے وابستہ کیا، اور اُن سے اُردو کی ترویج و اشاعت کا کام لیتے رہے۔ لکھنے اور بولنے کی مشق کی اہمیت ذہن نشین کروائی۔ چنانچہ ایسے بہت سے نوجوان شاعر و ادیب، جن کی زورؔ صاحب نے سرپرستی کی آج اُردو ادب میں ایک اچھا خاصا مقام رکھتے ہیں۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں، خاص طور پر ایوانِ اُردو میں کئی مشاعرے پڑھے ہیں۔ ایوانِ اُردو میں سجاد ظہیر صاحب کی زیر صدارت منعقدہ مشاعرہ میں، میں نے بھی اپنا کلام سنایا تھا۔ اُسی مشاعرہ میں پہلی دفعہ میں نے ڈاکٹر زورؔ کو بھی غزل سناتے ہوئے دیکھا تھا۔ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں بیت بازی کے بین کلیاتی مقابلے منعقد کئے گئے تھے تو ڈاکٹر زورؔ نے مجھے مقابلہ

بیت بازی کا کنوینر بنایا تھا۔ ڈاکٹر زورؔ کے انتقال کے بعد بھی میرا ربط ادارہ ادبیاتِ اُردو سے برقرار رہا۔ میں نے ادارہ کے کئی مشاعروں کی معتمدی بھی کی ہے۔ سب رس گولڈن جوبلی تقاریب' کی تیاریوں کے سلسلے میں کچھ مہینے اعزازی طور پر انچارج تقاریب کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس طرح ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی سرگرمیوں سے کسی نہ کسی طرح میری وابستگی رہی۔



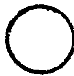
اُردو اورینٹل کالج

اُردو اورینٹل کالج، انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کے انتظامیہ کے تحت قائم ہوا۔ اس کالج کے فارغ التحصیل طلباء نے بھی زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی شناخت بنائی ہے۔ اُردو اورینٹل کالج میں داخلہ کے بعد میری شعری و ادبی زندگی کا رُخ ہی بدل گیا۔ میں جب بی۔ او۔ ایل کا طالب علم تھا تو اُردو اورینٹل کالج کی ادبی انجمن بزم ادبِ اُردو کا ۲۸ اگسٹ ۱۹۵۹ء کو بلا مقابلہ صدر منتخب ہوگیا۔ پھر میں جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام تمام ملحقہ کالجوں کے تعاون سے منعقدہ آخری اُردو فیسٹول کے مشاعرہ کا بلا مقابلہ معتمد منتخب کیا گیا۔ میں نے بی۔ او۔ ایل کے طالب علمی کے زمانے میں اپنے کالج (اُردو ہال) میں بین کلیاتی مقابلوں اور مختلف شعری و ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں دلچسپی لینی شروع

کی۔ میرے ذہن میں یہ بات پیوست ہوگئی تھی کہ شہر کے دوسرے کالجوں کے مقابلے میں شعروادب کی سرگرمیوں کے لئے اُردو کالج کو زیادہ سے زیادہ نمایاں رہنا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے مختلف قسم کی ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اُردو کالج کے اساتذہ میں پروفیسر ابوظفر عبدالواحد، پروفیسر سید محمدؐ، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر زینت ساجدہ، پروفیسر مغنی تبسم اور منظور احمد منظور قابل ذکر تھے۔ (یہ تمام اساتذہ میرے شفیق استادوں میں شامل رہے)۔ خاص طور پر پروفیسر ابوظفر عبدالواحد کا میری شاعرانہ صلاحیتوں کو نکھارنے میں زیادہ دخل رہا۔ وہ مجھے اپنے شاگردوں میں سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ میں اکثر اوقات اُن کے دولت خانہ (اعظم پورہ) پر حاضری دیتا اور شعروادب سے متعلق مختلف مسائل پر گفتگو کرتے ان سے استفادہ حاصل کیا کرتا تھا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد اور مغنی تبسم نے بھی میری حوصلہ افزائی میں کمی نہیں کی۔ میں نے بی۔او۔ال کامیاب کرنے کے بعد اُردو کالج میں ایم۔او۔ایل کے لئے داخلہ لیا لیکن میں نے ایک کلاس بھی اٹنڈ نہیں کی۔ ڈاکٹر حسینی شاہد مجھ سے کہا کرتے کہ میں مشاعرے پڑھنا کم کردوں اور امتحان کی تیاری میں لگا رہوں، اور یہ کہتے کہ ایم او ایل کامیاب کرنا بہت مشکل ہے، یوں ہی سرسری پڑھ کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ البتہ اُس شام کالج آیا تھا جس شام یونیورسٹی کے کچھ ذمہ داران معائنہ کرنے کے لئے آنے والے تھے۔ جب میں کالج پہونچا تو ڈاکٹر حبیب ضیاء درس دے رہی تھیں، اُن کی کلاس کے بعد کالج برخاست ہو گیا۔ ایم۔او۔ایل کا امتحان میں نے اپنے طور پر پڑھ کر دیا تھا اور الحمدللہ فرسٹ کلاس میں کامیاب رہا۔ ادیب کامل اور اُردو فاضل کے کورس میں بیشتر کتابیں ایسی تھیں جن کے مطالعہ سے ایم او ایل

کی کتب میں آسانی سے پڑھی جاسکتی تھیں، اس لئے مجھے اپنے طور پر پڑھنے میں دقت نہیں ہوئی۔ البتہ دکنی زبان کے سلسلے میں پروفیسر سید محمدؒ صاحب سے میں نے استفادہ حاصل کیا ہے۔

اُردو کالج کی طالب علمی کے زمانے میں اُردو مجلس کی سرگرمیاں شباب پر تھیں۔ منظور احمد اور مغنی تبسم اُردو مجلس کے معتمدین تھے۔ خاص طور پر منظور احمد صاحب نے اُردو مجلس کی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ منظور احمد نے مجلس کا موقر مجلہ بھی شائع کیا تھا۔ میں اُن دنوں منظور احمد صاحب سے مجلس کی اشاعت اور اُردو مجلس کے سالانہ جلسوں کے سلسلہ میں خاص طور پر تعاون کیا کرتا تھا۔ میری دلچسپی سے متاثر ہوکر صدر اُردو مجلس رائے جانکی پرشاد نے مجھ سے اُردو ہال کی ایک تقریب کے دوران کہا تھا کہ میاں آپ منظور صاحب کا ہاتھ بٹائیے بڑا احسان ہوگا۔ رائے جانکی پرشاد کا انداز ہی ایسا تھا کہ وہ ہر شخص سے نہایت انکساری کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے۔ اُردو مجلس کی جزوی وابستگی سے بھی شہر کے ادبی حلقوں اور ادبی شخصیتوں سے میرے روابط بڑھنے لگے۔ شاعر کی حیثیت سے بھی میری شہرت ہونے لگی۔



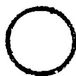
اُردو فسٹیول

میں جب بی۔ او۔ ایل کا طالب علم تھا تو آخری اُردو فسٹیول منعقد ہوا۔

۱۹۸۹ء کا فیسٹول، چھٹا فیسٹول تھا۔ اُس وقت میں بزمِ اُردو، اُردو کالج کا صدر تھا۔ چونکہ اُردو فیسٹول بین کلیاتی اُردو فیسٹول ہوتا تھا، جس میں مشاعرہ کے علاوہ کلچرل پروگرام، محفلِ موسیقی اور دیگر ادبی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ کالجس میں میری شاعری کی کچھ زیادہ ہی شہرت تھی، جس کی وجہ سے، میں اُردو فیسٹول مشاعرہ کا معتمد مشاعرہ منتخب ہوا۔ مسعود متین صدر اُردو فیسٹول تھے اور الطاف حسین معتمد، ہم تینوں ہم خیال تھے اور ہم میں اچھی خاصی دوستی تھی۔ (اس وقت مسعود متین ڈپٹی کمرشیل ٹیکس آفیسر ہے)۔ الطاف حسین ایک تاجرِ آبنوس کا لڑکا تھا (جو دو سال قبل ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا)۔ نہایت مخلص اور نفیس انسان تھا، خدا اس کو غریقِ رحمت کرے)۔ میری شاعری کے ابتدائی دور کے احباب میری زندگی کا اہم سرمایہ ہیں، جن کی یادیں آج بھی میری ہم سفر ہیں۔ اُردو فیسٹول کا نشہ جیسوں باقی رہا بلکہ اتنے برسوں کے بعد جب بھی اُن سرگرمیوں کا خیال آتا ہے تو زندگی کئی برس پیچھے جاتے ہوئے خوشبو کا سفر طے کرنے لگتی ہے۔ مشاعرہ کی صدارت، شاہد صدیقی صاحب نے کی تھی۔ جس میں حیدرآباد کے نامور شاعروں کے علاوہ مختلف کالجس کے نمائندہ شعراء نے کلام سنایا تھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ، مشیرِ اعلیٰ تھے۔ منظور احمد لکچرار اُردو کالج مشاعرہ کمیٹی کے مشیر تھے اور پروفیسر مغنی تبسم لکچرار سیف آباد کالج شبِ نغمہ کے مشیر تھے۔ مغنی تبسم اور منظور احمد کی طرح جناب حمیدالدین شطاری نے بھی کلچرل پروگرام کے مشیر کی حیثیت سے بڑا نمایاں کام انجام دیا۔

اُردو فیسٹول کی وجہ سے مختلف کالجس کے طلباء میں آپسی ہم آہنگی پیدا

ہو جاتی تھی۔ ایک ادبی و تہذیبی ماحول بن جاتا تھا۔ ہر سال اُردو فیسٹول نہایت شاندار پیمانے پر منائے جاتے رہے۔ چھٹا فیسٹول آخری تھا، اس کے بعد کچھ ایسے حالات ہوئے کہ اُردو طلباء کی سالانہ سرگرمیاں یک لخت ختم ہو گئیں۔ اب یہ حال ہے کہ کالجس اور یونیورسٹیوں میں بین جامعاتی فیسٹول کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ فیسٹول کے زمانے میں ہر کالج میں ایک عجیب قسم کی خوشگوار فضا سارے ماحول پر چھا جاتی تھی۔ ہر کالج میں انتخابات ہوتے، ہر کالج کی بزمِ اُردو کے صدر کو فیسٹول کی مختلف کمیٹیوں میں شامل کیا جاتا۔ فیسٹول کی اہم ترین اور دلچسپ تقاریب صرف تین ہوتی تھیں۔ ایک مشاعرہ، دوسرا شبِ نغمہ اور تیسرا کلچرل پروگرام۔ بالخصوص کلچرل پروگرام اور شبِ نغمہ کے سلسلے میں طلباء کو کافی محنت کرنی پڑتی تھی۔ فیسٹول کے زمانے میں ایک ادبی میگزین بھی شائع ہوتا تھا۔

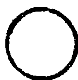


یوم محمد قلی قطب شاہ اور مقابلہ بیت بازی

میں جب اُردو اورینٹل کالج میں زیرِ تعلیم تھا تو اُس وقت بیت بازی کے مقابلوں میں کچھ زیادہ ہی حصّہ لیا کرتا تھا، بلکہ بعض دفعہ مجھے خود بھی بیت بازی کے مقابلوں کا اہتمام کرنا پڑتا تھا (چونکہ میں اُن دنوں بزمِ اُردو ادب، اُردو

کالج کا صدر تھا) بیت بازی کا یہ مقابلہ میرے لئے ایک یادگار مقابلہ ثابت ہوا۔ جس کو میں آج تک بھلا نہیں پایا۔ یہ بات ۱۹۶۰ء کی ہے۔ ڈاکٹر زور بقید حیات تھے۔ ادارۂ ادبیات اُردو کی سالانہ تقاریب (یوم محمد قلی قطب شاہ) کی سرگرمیوں کے سلسلے میں انٹر کالجس بیت بازی کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔ ڈاکٹر زور نے مجھے ان مقابلوں کا کنوینر مقرر کیا تھا' بیت بازی کے مقابلے علی کا لج' نواب طاہر علی خاں کی رہائش گاہ (معظم جاہی مارکٹ) میں ہوتے تھے۔ ویمنس کالج (کلیۂ اناث' کوٹھی) کی ٹیم فائنل میں آ گئی تھی۔ فاطمہ نسرین اُس وقت ویمنس کالج کی بزمِ اُردو کی صدر تھیں۔ جب میں پہلی مرتبہ صادق نقوی (متعلم نظام کالج) کے ہمراہ ویمنس کالج پہونچا تو سب سے پہلے میں نے ڈاکٹر ثمینہ شوکت سے ملاقات کی۔ وہ اُس وقت ویمنس کالج میں اُردو کی لکچرار ہی نہیں' بزمِ اُردو ویمنس کالج کی مشیر بھی تھیں۔ میں اُس وقت صدر بزم اُردو ادب' اُردو کالج اور کنوینر بین کلیاتی بیت بازی مقابلہ' کی حیثیت سے ویمنس کالج گیا تھا تاکہ بزمِ اُردو ویمنس کالج کی طالبات کو بھی مقابلوں میں شرکت کی دعوت دے سکوں۔ کچھ دیر بعد ثمینہ شوکت نے فاطمہ نسرین کو بلوایا۔ مجھ سے تعارف کروایا۔ ثمینہ شوکت نے یہ کہہ کر ویمنس کالج کی طالبات کو مقابلہ بیت بازی میں شرکت کی اجازت دی کہ میں ذمہ داری کے ساتھ ٹیم کی تمام طالبات کو اپنے ساتھ گولکنڈہ (گنبد محمد قلی قطب شاہ) لے جاؤں اور واپس لے آؤں۔ بیت بازی کا فائنل مقابلہ یوم محمد قلی قطب شاہ کے افتتاحیہ اجلاس سے قبل یعنی ۳ بجے سہ پہر گنبد محمد قلی قطب شاہ میں ہوا۔ اُس تقریب میں ممتاز شاعر جگن ناتھ آزاد آئے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے علامہ اقبال

کا ایک شعر پڑھ کر مقابلۂ بیت بازی کا آغاز کروایا۔ جس میں منظور احمد اور مغنی تبسم شامل تھے۔ حسنِ اتفاق سے ویمنس کالج کی ٹیم نے فائنل مقابلہ جیت لیا اور اُن لڑکیوں کو انعامات کے علاوہ خصوصی انعامات بھی دیئے گئے۔ جب اختتامیہ تقریب ختم ہوئی تو اُن لڑکیوں کو ذمہ داری کے ساتھ افضل گنج تک بس میں لے آیا، پھر وہاں سے انہیں رکشاؤں میں ان کے گھر بھجوادیا۔ میرے اس ذمہ دارانہ سلوک سے مختلف کالجوں کی تقاریب کے سلسلے میں ایک خوشگوار فضاء اُبھر آئی۔ مجھے ہر کالج سے مکمل تعاون حاصل ہوتا رہا۔ چنانچہ میں نے اُردو کالج کے زیرِ اہتمام ان دو سالوں کے درمیان کئی تقاریب کا اہتمام کیا۔ پھر ہم سبھوں نے مل کر اُردو فسٹیول منایا۔ وہ دو سال میری زندگی کے انمول اور سنہرے سال تھے، جنہیں میں تاحیات نہیں بھلا سکتا۔ (کالج کی سرگرمیوں کے زمانے میں ہاشم حسن سعید نے بھی مختلف مرحلوں پر میرا ساتھ دیا تھا۔)



اُردو مجلس

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے چند دوستوں کے تعاون اور مشوروں سے "اُردو مجلس" کے نام سے ایک ادبی انجمن کی بنیاد رکھی۔ ______

میں اُردو مجلس کا تقریباً ۱۷ سال تک معتمد عمومی رہ چکا ہوں۔ جب منظور احمد صاحب

نے اُردو مجلس سے استعفیٰ دے دیا تو اُن کے بعد نواب یسین علی خاں، ۶ ماہ تک معتمد رہے۔ جب وہ مستقل سکونت کے لئے لندن چلے گئے تو ان کے بعد میر حسن صاحب نے معتمد اُردو مجلس کی حیثیت سے زائد از ایک سال کام کیا، پھر ان کے بعد میں اور فاطمہ عالم علی خاں ۶ ماہ تک اُردو مجلس کے معتمد رہے۔ جب فاطمہ عالم علی خاں اپنی نجی مصروفیات کی وجہ سے اُردو مجلس سے بے تعلق ہوگئیں تو تنہا میں معتمد رہا۔ رائے جانکی پرشاد صدر تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد مولوی حبیب الرحمٰن صدر اُردو مجلس رہے۔ حبیب الرحمٰن صاحب پاکستان چلے گئے تو ڈاکٹر حسینی شاہد نے اُن کا ذمہ داری سنبھالی۔ ابتدا میں اُردو مجلس کے جلسوں میں شرکاء کی ایک اچھی خاصی تعداد رہتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ تعداد گھٹنے لگی۔ یہاں تک کہ میری معتمدی کے آخری دنوں میں ۱۰، ۱۵، اصحاب شرکت کرنے لگے تھے۔ اب ادبی جلسوں کے لئے اُردو ہال اتنا اہم مرکز نہیں رہا۔ قدیم شہر مغل پورہ میں اُردو گھر کی تعمیر کے بعد یوں لگتا ہے کہ اُردو ہال کی ساری ادبی سرگرمیاں اُردو گھر میں منتقل ہوگئی ہیں۔ میں نے اپنی معتمدی کے ۱۷ برسوں میں بلا وقفہ بے شمار ادبی جلسوں کا اہتمام کیا ہے۔ اُردو ہال میں بڑے بڑے دانشوروں کا خیر مقدم کیا گیا۔ ابتدا میں اُردو مجلس کے جلسے اراکینِ اُردو مجلس کے گھروں میں ہوا کرتے تھے، پھر جب اُردو ہال کی عمارت تعمیر ہوئی تو اُردو ہال میں جلسے ہونے لگے۔



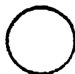
روزنامہ سیاست

جب میں اُردو کالج میں بی۔او۔ایل کا طالب علم تھا تو اُس زمانے میں کالج کی ادبی سرگرمیاں کافی حد تک بڑھ چکی تھیں۔ میں کالج کی بزم اُردو کا صدر تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اُردو کالج کی سرگرمیاں شہر کے دوسرے کالجس کے مقابلے میں نمایاں رہیں۔ کالج کے جلسوں کی خبریں روزنامہ سیاست، رہنمائے دکن، نظام گزٹ اور ملاپ کے آفس، جاکر دیا کرتا تھا۔ ایک دن جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست نے جناب شاہد صدیقی کو (جو وہاں موجود تھے) مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ یہ صلاح الدین نیّر ہیں۔ اُردو کالج کی بزم اُردو کے صدر۔ بزمِ اُردو کی نیوز لے کر آتے ہیں۔ شاہد! انہیں محفلِ شعر کا کالم دے دو۔ (ان دنوں شاہد صدیقی صاحب سیاست میں شیشہ و تیشہ کا کالم لکھنے کے علاوہ محفلِ شعر بھی ترتیب دیا کرتے تھے، یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے)۔ شاہد صدیقی نے مجھے محفلِ شعر کی ذمہ داری سونپی۔ چنانچہ میرا معمول تھا کہ ہر چہارشنبہ کی شام سیاست چلا جاتا اور محفلِ شعر کا کالم ترتیب دیتا۔ یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ اخبار سیاست میں مختلف موضوعات پر شعری و ادبی نئے کالموں کا اضافہ ہوگیا۔ محترم عابد علی خاں اور جناب محبوب حسین جگر کی خواہش پر میں نے سیاست کے لئے مختلف ”حسنِ سخن“ شعری مقابلے“ با محاورہ اشعار“ شعر میں تشبیہات“ بہترین اشعار کا انتخاب“ الف“ سے شروع ہونے والے اور ی“ پر ختم ہونے والے اشعار کا انتخاب اور تقریباً ۱۲۵ شاعروں کا تعارف مع

نمونۂ کلام" لکھا اور یہ سلسلہ محمد قلی قطب شاہ سے دورِ حاضر کے شاعروں تک جاری رہا۔ بہترین اشعار پر انعامات کا سلسلہ تقریباً زائد از ۵ سال تک جاری رہا۔ ایک ماہ کے بعد ججس کی میٹنگ ہوتی تھی (میں کنوینر رہتا) اور انعام یافتگان (اول و دوم میں آنے والوں) کو ادارۂ سیاست کی جانب سے رقمی مدد دی جاتی۔ انعامات کے اعلان کے ساتھ ججس کی تصویریں گروپ کی شکل میں شائع ہوتی تھیں۔ میں ۱۹۶۰ء سے "سیاست" سے وابستہ ہوں۔ اب تو میرا زیادہ وقت سیاست ہی میں گذرتا ہے۔ محترم جگر صاحب مجھ سے کبھی سب ایڈیٹری کا کام لیتے ہیں تو کبھی پریس کانفرنس اور کبھی جلسوں کی رپورٹنگ کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر میں شعبۂ شعر و سخن سے تعلق رکھتا ہوں، لیکن جگر صاحب مجھ سے ادبی اور صحافتی دونوں کام لیتے ہیں۔ اور یہ تمام کام انتہائی خوشگوار ماحول اور باعتماد فضاء میں انجام پاتے ہیں۔ بقول جناب عابد علی خاں "میری صبح سیاست سے شروع ہوتی ہے اور شام یہیں پہ ختم ہوتی ہے"۔ —— سیاست سے وابستگی نہ صرف میرے لئے اعزاز ہے بلکہ اُن سب کے لئے ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے سیاست سے تعلق رکھتے ہیں۔

جناب عابد علی خاں مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان ہیں، اسی طرح جگر صاحب کی عنایتوں کا ایک سلسلۂ لامتناہی میرے شامل حال ہے۔ عابد علی خان صاحب کی سفارش کی وجہ سے ہی میرے بڑے لڑکے شمس الدین عارف کو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں، ایم ایس سی میں داخلہ ملا۔ (جبکہ وہاں جناب علی محمد خسرو وائس چانسلر تھے) نظام کالج سے بی۔ ایس سی فرسٹ کلاس ہونے کے باوجود عثمانیہ یونیورسٹی میں ایم۔ ایس سی میں داخلہ نہیں ملا، جس کی وجہ سے عارف کو علی گڈھ جانا پڑا۔ جناب

عابد علی خاں اور جناب محبوب حسین جگرؔ، میرے دوستوں اور کرم فرماؤں کے سلسلہ میں بھی بھرپور تعاون کیا کرتے ہیں۔ جناب عابد علی خاں اور جناب محبوب حسین جگرؔ نے مجھے ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھا، جو ہمیشہ میرے وقار کا بھی پوری طرح خیال رکھتے ہیں۔ ادارۂ سیاست اور ان دونوں شخصیتوں نے میری ذہنی تربیت میں اہم رول ادا کیا ہے۔ سیاست کی وجہ سے میرا سوشیل پوزیشن بھی اچھا خاصا بن گیا ہے۔ مجھ پر یہ دونوں شخصیتیں بھرپور اعتماد کرتی ہیں۔ میں نہایت دیانت داری اور ایمانداری کے ساتھ اس اعتماد کو نبھا رہا ہوں۔ انشاء اللہ ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہونچے گی۔



نظام گزٹ

جس زمانے میں عبدالرحمٰن حلمیؔ، نظام گزٹ کے انچارج تھے، اُس وقت میں اپنے ایک شاعر دوست عظمت ندیمی کے ساتھ اُن سے ملا تھا۔ میرے ادبی و شعری ذوق کو دیکھ کر حلمی صاحب نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں نظام گزٹ میں شعر و سخن کے کالم کا اضافہ کروں۔ چنانچہ میں ہر ہفتہ اُردو کے ایک ممتاز شاعر کا انتخابِ کلام شائع کیا کرتا تھا۔ یہ کالم اس قدر مقبول ہوا کہ ایک دن حضور نظام (نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع) نے حلمی صاحب سے دریافت کیا کہ یہ

صلاح الدین نیّر کون ہے۔ (غالباً یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے)۔ اُس زمانے میں مجھے اُردو کے اہم شاعروں کا کلام پڑھنے کا شوق تھا اور میں اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے ہر شاعر کے تمام شعری مجموعوں کے مطالعہ کے بعد اچھے اشعار کا انتخاب کیا کرتا تھا۔



خاتونِ دکن

ماہنامہ خاتونِ دکن کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ چوتھے شمارہ (مارچ ۱۹۶۲ء) سے میں بہ حیثیت مدیر اعزازی رسالہ سے وابستہ ہوا۔ ہر شمارہ ۴۸ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ صالحہ الطاف مالک و مدیرہ کے علاوہ مجلس ادارت میں ان کی چار بہنیں اختر سلطانہ، صبیحہ سعید، صابرہ سعید اور عذرا سعید شامل تھیں۔ خاتونِ دکن کی اشاعت کے سلسلے میں صالحہ کے شوہر جناب الطاف حسین کے ادبی ذوق و تعاون کا بڑا دخل رہا ہے۔

خاتونِ دکن کے پہلے شمارہ کی رسمِ اجراء تقریب رویندرا بھارتی تھیٹر میں اُس وقت کے گورنر آندھرا پردیش کے ہاتھوں انجام پائی، جس میں شہر کے تقریباً تمام اہم شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اصحاب نے شرکت کی تھی۔ میں بھی اس تقریب میں شریک تھا۔ رسمِ اجراء

کے فوری بعد شاندار پیمانے پر کلچرل پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔ جلسہ کے اختتام پر صالحہ الطاف سے ملاقات ہوئی۔ میں نے رسالہ کی اشاعت پر انہیں مبارکباد دی۔ صالحہ الطاف سے میری پہلی ملاقات بانو طاہرہ سعید کی رہائش گاہ واقع شانتی نگر پر ایک پُرتکلف عصرانہ اور محفلِ شعر کے موقع پر ہوئی تھی۔ صالحہ الطاف نے "خاتونِ دکن" کے سلسلے میں مجھ سے تعاون کی خواہش کی۔ میں حسب وعدہ اُن کے گھر واقع مگر باؤلی (متصل میر عالم) گیا۔ بانو طاہرہ سعید نے صالحہ کو مشورہ دیا تھا کہ رسالہ کی اشاعت کے سلسلے میں میری خدمات نیک شگون ہوں گی۔ اس لئے انہوں نے مشاورت اور تعاون کے لئے مجھے باصرار اپنے گھر بلوایا تھا چونکہ صالحہ الطاف صحافتی میدان میں نئی نئی داخل ہوئی تھیں، ان سے ملاقات کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ بانو طاہرہ سعید نے میری کچھ زیادہ ہی تعریف کی تھی۔ صالحہ الطاف نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے پرچہ کی تمام تر ذمہ داری سونپ دی۔ صالحہ الطاف سے میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اعزازی طور پر کام کروں گا، چونکہ مجھے خود بھی اُردو شعر و ادب سے بے حد دلچسپی ہے، رسالہ سے وابستگی کی وجہ سے میرے شعری و ادبی ذوق کی مزید تسکین ہو سکتی تھی۔ میں نے صالحہ الطاف سے یہ بھی کہا تھا کہ شاعروں اور ادیبوں سے میں خود ہی خط و کتابت کروں گا، اس لئے کہ میں حیدرآباد اور ملک کے بیشتر شاعروں اور ادیبوں سے واقف ہوں، اُن سے تخلیقات کے حصول میں آسانی ہوگی۔ صالحہ نے اس بات سے مکمل اتفاق کیا۔

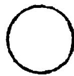
"خاتونِ دکن" کے نام سے ادبی حلقوں کا یہ خیال تھا کہ یہ رسالہ خاتون مشر

کی طرح صرف خاتون ادیبوں اور شاعرات کے لئے مختص رہے گا، لیکن ہم نے اس رسالہ کو خالص ادبی رسالہ بنا دیا، جس میں مرد و خواتین اہل قلم کی تخلیقات شامل رہتی تھیں۔ خاتونِ دکن کی ابتدائی ۳، ۴ اشاعتوں میں کافی اخراجات ہوگئے تھے، میں نے جیسے ہی پرچہ کی ذمہ داری سنبھالی، پرچہ خود مکتفی ہوگیا۔ خانگی اشتہارات کی ذمہ داری الطاف بھائی نے قبول کی تھی۔ میری سعی عمیم کی وجہ سے حکومتِ ہند، ریاستی حکومت اور دیگر کمپنیوں وغیرہ کے اشتہارات خاتونِ دکن کو حاصل ہونے لگے۔ جب الطاف بھائی اور صالحہ آپا دوحہ قطر چلے گئے تو رسالہ بند ہوگیا۔

خاتونِ دکن کے تبادلے میں ہر ماہ تقریباً ۲۵ رسالے ہندوستان و پاکستان سے آتے تھے جو میرے ذوق کی تسکین کے لئے ایک اہم سرمایہ تھے۔ میں نے خاتونِ دکن کے ذریعہ کئی نئے لکھنے والوں کو ادبی حلقوں میں روشناس کرایا ہے۔

میں اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ حیدرآباد کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات زیادہ سے زیادہ شائع ہوں، لیکن معیار کا بہرحال [illegible] جاتا تھا۔ تمام تخلیقات کا انتخاب ہم دونوں مل کر کرتے تھے۔ اداریہ کبھی صالحہ الطاف لکھتیں اور کبھی میں لکھتا۔ ترتیب و تزئین میں بھی ہم دونوں کی مشاورت شامل رہتی۔ نعت کلام و ذہن کا صفحہ اختر سلطانہ کے ذمے تھا، صبیحہ سعید عکسِ جمیل کے زیرِ عنوان کسی ایک نامور شاعر کا انتخابِ کلام شائع کرواتی تھیں۔ صابرہ سعید اُردو کے بہترین شعروں کا انتخاب پیش کرتیں اور عذرا سعید کے ذمہ ڈیزائن ،

مرقعے اور سرورق تھا۔
خاتونِ دکن کے بعض خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے ہیں جن میں قابلِ ذکر غزل نمبر اور ڈرامہ نمبر ہیں۔ صالحہ الطاف کا گھرانہ علم و ادب سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اُن کے والدِ محترم جناب احمد سعید کامیاب تاجر ہونے کے علاوہ علم و ادب سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ ممتاز صحافی جناب حبیب اللہ اوج مدیر 'میزان' (حیدرآباد) (جو پاکستان کے شہری ہیں) صالحہ آپا کے حقیقی چچا ہیں۔ صالحہ الطاف ایک منفرد ادیب و ڈرامہ نگار کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔



بزمِ سعدی

۲۵ر جون ۱۹۵۹ء کو بزمِ سعدی کا قیام عمل میں آیا، جس کے بانیوں میں حضرت قدر عریضی، ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم اور قمر ساحری کے علاوہ راقم الحروف شامل ہے۔ یہ بزم فارسی داں شعراء کی بزم تھی، جس کے صدر حضرت قدر عریضی تھے۔ نائب صدر ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم، معتمد قمر ساحری اور شریک معتمد صلاح الدین نیّر اسی بزم کے تحت ماہانہ فارسی طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ میں اپنا فارسی کلام محفوظ نہ رکھ سکا۔ میرے مجموعۂ کلام 'یہ کیسا رشتہ ہے' میں ایک فارسی منقبت شامل ہے۔



ادارۂ اتحاد الشعراء

بزم قدر ادب کی جانب سے حضرت قدر عریضی کی قیام گاہ واقع باغ فرید ون جاہ (حسینی علم) میں ۱۱ رجون ۱۹۶۰ء کو ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں یہ طے پایا کہ ادارۂ اتحاد الشعراء کا قیام عمل میں لایا جائے۔ چنانچہ انجمن سخنستانِ دکن، زاویہ ادب، ادبستانِ مخفی، بزمِ کامل، بزمِ جیوتی۔ سفینۂ ادب اور قدر ادب کے تعاون سے ایک نئی انجمن تشکیل دی گئی۔ باتفاق آراء علامہ نجم آفندی صدر اور صلاح الدین نیر معتمد عمومی منتخب ہوئے۔ اراکین میں حضرت قدر عریضی، تاج قریشی، عبدالحمید عیالی اور ریورینڈ ریحانی شامل تھے۔ اس اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ مشاعرہ میں وقت کی پابندی کی جانی چاہیئے اور اگر کوئی شاعر مشاعرہ شروع ہونے کے نصف گھنٹہ بعد آئے تو اس کو کلام سنانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس قسم کی انجمن کا قیام حیدرآباد کی تاریخ میں پہلا ادبی تجربہ تھا۔ اس ادارہ سے حیدرآباد کی تقریباً ۲۵ شعری و ادبی انجمنوں کا الحاق ہوا تھا، جس کا میں ادارۂ کے ختم ہونے تک معتمد عمومی رہا۔ ادارہ کے سرپرستوں میں ڈاکٹر زور کے علاوہ مولانا سید شیخ احمد شطاریؒ اور علامہ قدر عریضی رہے۔ اس ادارہ کا حیدرآباد کے ممتاز شاعر و کالم نویس جناب شاہد صدیقی، روزنامہ سیاست کے شیشہ و تیشہ کے کالم میں خاکہ اڑایا کرتے تھے۔ شاہد صاحب کا یہ خیال تھا کہ شعراء کو وقت پر مشاعروں میں شرکت کے لئے پابند کرنا ممکن نہیں۔ شاعر آزاد مزاج ہوتا ہے، جب اس کا جی چاہے، جس وقت چاہے مشاعرہ

میں شریک ہو سکتا ہے۔ جب ادارہ اتحاد الشعراء کے تعلق سے سیاست کے شیشہ و تیشہ کے کالم میں مسلسل لکھا جانے لگا تو میں نے جگر صاحب (محبوب حسین) جوائنٹ ایڈیٹر سیاست سے شکایت کی کہ شاہد صدیقی صاحب اتحاد الشعراء کا مذاق اُڑا رہے ہیں تو جگر صاحب نے مجھے نہایت عمدگی سے سمجھایا کہ شیشہ و تیشہ ایک ایسا کالم ہے جس میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اُس میں مزاح شامل رہتا ہے (چونکہ یہ طنز و مزاح کا کالم ہے)۔ اس کالم کے ذریعہ کسی انجمن یا کسی شخص کا مذاق اُڑانا پیش نظر نہیں رہتا، آپ کو چنداں خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ادارۂ اتحاد الشعراء تقریباً ۵، ۶ سال تک کام کرتا رہا، اس کے بعد یہ ادارہ ختم ہوگیا۔ چونکہ میں 'قدرِ ادب' کا معتمد عمومی تھا، اس لئے اتحاد الشعراء کے معتمد کی حیثیت سے کام کرنے میں مجھے سہولت رہی۔ میں اس بزم کے مشاعروں کے سلسلے میں اپنے اُستاد (علامہ قدر عریضی) سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ اتحاد الشعراء کے مشاعرے حضرت قدر عریضی کی قیام گاہ باغ فرید و نجاہ (حسینی علم) پر ہی ہوتے تھے۔ جس میں حیدرآباد کے تمام مکتب خیال کے شعراء شرکت کرتے تھے۔ مشاعروں میں آدابِ محفل کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا۔



بزمِ جیون

مشہور تاجر پارچہ جناب آر۔ آر۔ جیون لال نے پرانے شہر (محلہ مٹی کا شیر)

میں بزم جیون کا قیام عمل میں لایا تھا اس بزم کے مشاعرے پابندی سے ہوا کرتے تھے جس میں مخدوم محی الدین صاحب جیسے سرکردہ شاعروں نے بھی شرکت کی تھی۔ میری خواہش پر مخدوم صاحب نے ایک مشاعرہ کی صدارت بھی کی تھی۔ میں اس بزم کا تقریباً دو سال تک معتمد عمومی رہا۔ فیض الحسن خیال شریک معتمد تھے۔ جیون لال صاحب کو شعر و شاعری کا بے حد شوق تھا، چونکہ اُن کا کلام زیادہ تر شوخ اور ساقط البحر ہوتا تھا، اس وجہ سے بھی بعض اصحاب صرف اُن کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے تھے۔ اس بزم کے مشاعروں میں حیدرآباد کے تمام نمائندہ شعراء شریک رہتے تھے۔ مجھ سے پہلے جناب روحی قادری معتمد تھے۔ جیون لال صاحب کے سانحۂ ارتحال کے بعد یہ بزم ختم ہوگئی۔ میں نے اپنی معتمدی کے زمانے میں اس بزم کی سرگرمیوں کو کافی وسعت دی تھی۔ اس بزم کے اکثر مشاعرے طرحی ہوا کرتے تھے، جن میں ہر مکتبِ خیال کے شاعر کلام سناتے تھے۔



ادبی ٹرسٹ

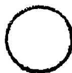
قیامِ ادبی ٹرسٹ (۱۹۶۶ء) سے میں ایک بے لوث خدمت گزار کی حیثیت سے بلا معاوضہ ادبی ٹرسٹ کی سرگرمیوں سے وابستہ ہوں۔ ایک دن جناب عابد علی خاں منیجنگ ٹرسٹی ادبی ٹرسٹ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ ادبی ٹرسٹ کی سرگرمیوں میں تم بھی دلچسپی لو۔ ٹرسٹ کو ایک بے لوث، کارکرد اور ایک دیانت دار

ساتھی کی ضرورت ہے۔ میں نے جواباً کہا تھا، انشاء اللہ آپ کا مجھ پر یہ اعتماد ہمیشہ برقرار رہے گا۔ چنانچہ تادم تحریر اُسی اعتماد کی فضاء میں کام کر رہا ہوں۔ کُل ہند مشاعروں کی خط و کتابت کا کام بھی زیر نگرانی جناب عابد علی خاں میرے ذمے ہی رہتا ہے۔ سوائے اکاؤنٹس کے سارے انتظامی معاملات سے میں کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ رہا کرتا ہوں۔ عابد علی خاں صاحب کی سرپرستی میں بلا شکایت نہایت ذمہ داری سے باوقار انداز کے ساتھ پُر اعتماد فضاء میں ٹرسٹ کا کام انجام دے رہا ہوں۔ ادبی ٹرسٹ کی سرگرمیاں، خدمات کی اعلیٰ سطح تک پہونچ گئی ہیں۔ کُل ہند مشاعروں کا شہرہ جناب عابد علی خاں کی شخصی دلچسپی کا آئینہ دار ہے۔ اب تک ۲۷ مشاعرے ہوچکے ہیں۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں میں ملک کے تمام اہم شاعروں نے شرکت کی ہے۔ پاکستان اور دیگر بیرونی ممالک شاعر بھی شرکت کرتے رہتے ہیں۔ صفِ اوّل کے شاعروں کی شرکت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ جناب عابد علی خاں نے مشاعروں کی آمدنی سے ادبی ٹرسٹ، اُردو گھر ٹرسٹ، اُردو تعلیمی ٹرسٹ، ادارۂ ادبیاتِ اُردو ٹرسٹ، ویمن آف عثمانیہ ٹرسٹ قائم کیا ہے۔ انوار العلوم کالج اور دکن میڈیکل کالج کی رقمی اعانت کی۔ ادبی ٹرسٹ کے زیر اہتمام کئی شاعروں اور ادیبوں کی کتابوں کی اشاعت کے لئے رقمی امداد دی گئی ہے۔ طبّی اعانت کے لئے بھی امداد دی جاتی ہے، اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ میڈیکل کالج اور انجینئرنگ کالج کے طلباء کو بھی تعلیمی امداد دی جاتی ہے۔ ادبی ٹرسٹ ایک ایسا مستحکم ادارہ ہے جس کا فیضان مختلف صورتوں میں شعر و ادب کے پرستاروں تک پہونچتا رہتا ہے۔ ایسے مقصدی ادارہ میں کام کرتے ہوئے مجھے بے حد خوشی محسوس ہوتی ہے۔

ادارۂ شعر و حکمت

ادارۂ شعر و حکمت سے زائد از ۲۵ برس سے بحیثیت معتمد عمومی وابستہ ہوں۔ ڈاکٹر مغنی تبسم اس ادارہ کے بانی و صدر ہیں۔ اس ادارہ کے تحت بعض خاص مواقع پر ادبی محفلیں ہوا کرتی ہیں۔ اکثر شاعروں اور ادیبوں کی کتابوں پر ناشر کی حیثیت سے اس ادارہ کا نام استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ ادارہ ادبی حلقوں میں اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے اس لئے بہت سے قلم کار کسی نہ کسی عنوان کے تحت ادارہ سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس ادارہ کی جانب سے کئی شاعروں اور ادیبوں کی کتابوں کی رسم اجراء تقاریب بھی منائی جا چکی ہیں۔ بیرونی دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کا ادارہ کی جانب سے خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

ادارۂ شعر و حکمت کی جانب سے ایک ششماہی ادبی رسالہ 'شعر و حکمت' کے نام سے شائع ہوتا ہے، جس کا پہلا شمارہ ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ ادارہ کے اغراض و مقاصد میں ادبی جلسے، سمینار منعقد کرنا، رسالہ کی اشاعت، اور اشاعتِ کتب شامل ہیں۔ "شعر و حکمت" نے اردو میں جدیدیت کو فروغ دینے میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔ اس رسالہ کو ہندوستان و پاکستان کے تقریباً تمام اچھے لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہے۔

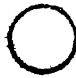


زندہ دلانِ حیدرآباد

زندہ دلانِ حیدرآباد سے میرا دیرینہ تعلق ہے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام جب پہلی کل ہند کانفرنس (۱۴ر، ۱۵ر مئی ۱۹۶۶ء میں) منعقد ہوئی تھی (جس میں کرشن چندر، فکر تونسوی، پروفیسر فرقت کاکوروی، تخلص بھوپالی، یوسف ناظم، خواجہ عبدالغفور، احمد جمال پاشا، سلمیٰ صدیقی، دلاور فگار، رضا نقوی واہی وغیرہ نے شرکت کی تھی) میں نے چیرمین رابطہ کمیٹی کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھالی تھیں۔ میں زندہ دلانِ حیدرآباد کی سرگرمیوں سے اس کانفرنس کے بعد سے وابستہ ہو گیا۔ گذشتہ دو سال سے پروگرام کمیٹی کا کنوینر ہوں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی شہرت نہ صرف سارے ملک میں بلکہ عالمی ہو چکی ہے۔ سارے ملک میں مزاح نگاروں کی یہ پہلی انجمن ہے جس نے طنز و مزاح کو فروغ دینے میں اہم حصہ ادا کیا ہے، جس کی سالانہ تقاریب میں ملک کے نامور طنز و مزاح نگار شرکت کیا کرتے ہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے اہم خدمت گذاروں میں مجتبیٰ حسین، حمایت اللہ، ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، مصطفیٰ علی بیگ، مسیح انجم، شاہد قیصر، سعادت حسین، محمد سلیمان، طالب خوندمیری، رشید قریشی، ڈاکٹر حبیب ضیا، لڈن حیدرآبادی وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ لئے جا سکتے ہیں۔ آج بھی زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ اجلاس اور مشاعرے شاندار پیمانے پر منعقد ہوتے ہیں۔ اس ادارہ کا ترجمان ماہنامہ "شگوفہ" ہے جو ممتاز ادیب و نقاد ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کی ادارت میں گذشتہ ۲۳ سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، جس کے خصوصی نمبر ایک دستاویزی حیثیت کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ اس رسالہ کی وجہ سے بہت سے نئے لکھنے والوں نے ادبی حلقوں میں اپنی شناخت بنالی ہے۔ یہ پرچہ آج بھی اہتمام کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ اجلاس کے موقع پر سوونیر بھی شائع کیا جاتا ہے۔

شگوفہ کی مجلسِ ادارت میں راقم الحروف بھی شامل کیا گیا ہے۔ شگوفہ کا آفس معجزگاہ (معظم جاہی مارکٹ) کی اوپری منزل پر واقع ہے۔ اس دفتر پر اکثر شام کے وقت کچھ شاعر و ادیب جمع رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال نام و نمود سے بے نیاز رہ کر خاموشی سے کام کرنے کے عادی ہیں، جن کے اطراف، ان کے احباب کا بڑا حلقہ موجود رہا کرتا ہے، صدر شعبۂ اردو انوار العلوم کالج کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔



سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن

فضل علی کمیشن کی رپورٹ کی روشنی میں ریاستوں کی تقسیم کے بعد میرا متعلقہ محکمہ ڈائرکٹریٹ آف کمیونٹی پروجکٹ، سکریٹریٹ کے پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ ڈپارٹمنٹ میں ضم ہوگیا (چونکہ میرے محکمہ کا ایک سکشن سکریٹریٹ کے

پلاننگ ڈپارٹمنٹ سے وابستہ تھا)۔ جنوری ۱۹۵۷ء سے میں سکریٹریٹ میں کام کرنے لگا ہوں۔

سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی شعری، ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کا ذکر کرنے سے پہلے اُن محرکات کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتا ہوں، جن کی روشنی میں سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس اسوسی ایشن سے پہلے سکریٹریٹ میں کسی بھی قسم کی اُردو انجمن کا وجود نہیں تھا۔

ریاستوں کی تقسیم (۱۹۵۶ء) کے بعد سکریٹریٹ، میں آندھرا پردیش سکریٹریٹ کلچرل اسوسی ایشن کی سرگرمیوں کا بڑا شہرہ تھا۔ اے پی کلچرل اسوسی ایشن کے زیر اہتمام ہر سال نومبر، ڈسمبر کے اواخر میں سالانہ تقاریب کے طور پر سات روزہ کلچرل پروگرامس ہوا کرتے تھے جس میں اُردو کا کوئی بھی پروگرام شامل نہیں رہتا تھا، اگر شامل بھی رہا تو برائے نام مختصراً میوزیکل پروگرام رہتا تھا۔ چونکہ ہم اُردو والے بھی کلچرل اسوسی ایشن کے ممبر ہوا کرتے تھے، اس لئے ہماری کوششوں سے بہ دقت تمام سات روزہ پروگرام کے دوران کسی ایک دن (۳۰) منٹ یا ایک گھنٹہ کا اُردو پروگرام ہوتا تھا۔ اس مختصر مدت میں ہم لوگ کبھی اُردو ڈرامہ پیش کرتے اور کبھی محفل موسیقی کا اہتمام کرتے اور کبھی مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔

اُن دنوں آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے اُردو کی بعض انجمنوں کو پروگرامس ملا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں سکریٹریٹ میں کوئی اُردو انجمن نہیں تھی، اس لئے میں نے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے شعبۂ اُردو کے پروگرام اگزیکیٹو مسٹر پاترو سے (جو میرے دوست تھے) خواہش کی کہ آندھرا پردیش سکریٹریٹ کلچرل اسوسی ایشن

کے نام کنٹراکٹ فارم روانہ کریں ۔ مسٹر پاترو نے حسب وعدہ اُردو پروگرام کی پیشکشی کے لئے سکریٹریٹ کلچرل اسوسی ایشن کے نام کنٹراکٹ فارم روانہ کیا، لیکن اسوسی ایشن کے ڈائرکٹر نے یہہ لکھ کر کنٹراکٹ فارم واپس کیا کہ ہماری اسوسی ایشن اُردو پروگرام پیش کرنے کے موقف میں نہیں ہے۔ جب مجھے یہ بات مسٹر پاترو سے معلوم ہوئی تو میں نے ارادہ کرلیا کہ حاصل کردہ پروگرام سے کسی بھی صورت میں استفادہ کرنا چاہیئے ۔ چونکہ پروگرام کی پیش کشی کے لئے کسی ایک اسوسی ایشن کا ہونا ضروری تھا ' اس لئے میں نے سکریٹریٹ کے چند ہم خیال دوستوں سے انجمن کے قیام کے بارے میں مشورہ کیا۔ پھر میں نے فون پر جناب بھارت چند کھنّہ سے (جو اُس وقت گورنر آندھرا پردیش کے سکریٹری تھے) صدر انجمن بننے کی خواہش ظاہر کی ۔ اسی طرح فون پر ہی نائب صدور کے لئے جناب غلام احمد صاحب اور جناب رشید قریشی سے جو علی الترتیب ڈپٹی سکریٹری اور اسسٹنٹ سکریٹری تھے، خواہش کی میرے اصرار پر ان تینوں عہدہ داروں نے ازراہ ادب نوازی میرے جذبہ کی ستائش کی ۔ پھر میرے احباب نے انجمن کی معتمدی کی ذمہ داری مجھے سونپی ۔ اُس وقت کے قابلِ ذکر احباب میں خواجہ بہار الدین، افضل حسین، علیم الدین، بی ۔ این ۔ واگمرے، عباس ہاشمی اور بشیر اللہ شامل ہیں۔ اس طرح ۲۴ ؍ جون ۱۹۶۹ء کو سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔

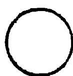
سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کا آغاز ۔

۱۲؍ جولائی ۱۹۶۹ء کو آل انڈیا ریڈیو کے اُردو پروگرام سے ہوا ۔ ۲۰ منٹ کے اس پروگرام میں افضل حسین اور سیدہ محسنہ نے افسانے سنائے ۔ صوفیہ انجم تاج نے

بشیر انور نے غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ کچھ دنوں کے بعد اسوسی ایشن کو پُر وقار بنانے کے لئے اُس وقت کے ایڈیشنل چیف سکریٹری جناب ایس۔ اے۔ قادر کی اسوسی ایشن کے لئے سرپرستی حاصل کی گئی۔ جب جناب ایس۔ اے۔ قادر، صدر نشین پبلک سروس کمیشن بن کر سکریٹریٹ سے چلے گئے تو سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے سرپرست کی حیثیت سے جناب راجہ کنج بہاری لال کی خدمات سے استفادہ کیا جاتا رہا، جو اُس وقت ایڈیشنل چیف سکریٹری تھے۔ ان کے بعد چیف سکریٹری حکومت آندھرا پردیش جناب شراون کمار اسوسی ایشن کے سرپرست رہے۔ انجمن کے قیام کے بعد علی الترتیب جناب بھارت چند کھنہ، جناب غلام احمد، جناب ایس۔ اے۔ واسع اور جناب صادق احمد انجمن کے صدر رہے۔ اِس وقت جناب تراب الحسن صدر ہیں۔ نائب صدر کی حیثیت سے سکریٹریٹ کے اعلیٰ عہدیدار مسرز ہاشم علی اختر، رامن راؤ، ایس۔ اے۔ واسع، یس اے عزیز، صادق احمد رشید قریشی، مبشر احمد، [illegible] کرن، اور سعد حسین سعد وغیرہ انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ معتمد [illegible] کی حیثیت سے قیام انجمن سے ہی میں کام کر رہا ہوں۔ شعبۂ موسیقی کے انچارج کی حیثیت سے خواجہ بہاء الدین، محمد حسین خاں، عباس ہاشمی اور شکیل احمد وابستہ رہے۔ اس وقت ڈاکٹر عزیز الرحمان منیر اور شکیل احمد شریک معتمد ہیں۔ جناب بہاء الدین شعبۂ موسیقی کے انچارج ہیں۔ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کا پہلا ادبی پروگرام سکریٹریٹ کے کیفے ٹیریا ہال میں ۱۲ جولائی [illegible] کو ہوا، جس کی صدارت صدر اسوسی ایشن جناب بھارت چند کھنہ نے کی تھی۔ جبکہ سرپرست انجمن کی حیثیت سے جناب ایس۔ اے۔ قادر ایڈیشنل چیف سکریٹری نے شرکت کی تھی۔

اُن محفلوں میں ریاستی وزراء، مختلف محکموں کے معتمدین اور دیگر اعلیٰ عہدہ دار شریک ہوتے رہے ہیں۔ اس انجمن کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس انجمن کی رکنیت کی کوئی فیس نہیں ہے۔ اب تک بیسیوں ریڈیائی پروگرامس پیش کیے جاچکے ہیں ریڈیائی پروگرام سے معاوضہ بھی ملتا ہے، اُن ہی ذرائع سے وقتاً فوقتاً ہونے والے جلسوں اور مشاعروں کے اخراجات کی تکمیل کی جاتی ہے۔ اس اسوسی ایشن کا ایک اہم کارنامہ ایک ادبی سووینیر کی اشاعت بھی ہے جس میں سکریٹریٹ کے اہل قلم اعلیٰ عہدہ داروں اور دیگر ملازمین کی تخلیقات کے علاوہ دفاترِ معتمدین کے مختلف محکمہ جات میں کام کرنے والے ادب دوست اصحاب کے گروپ فوٹوز بھی شامل ہیں۔ سووینیر کی اشاعت، مالیہ کی فراہمی اور اُس کی صورت گری میں جناب ایس۔ اے۔ واسع کا زبردست تعاون حاصل رہا۔ یہ یادگار دستاویزی سووینیر ۲۴؍ اگست ۱۹۷۶ء کو شائع ہوا، جس کا مدیر میں تھا۔ اُردو اسوسی ایشن کا ایک شعبۂ موسیقی بھی ہے، جس کے اراکین ہر سال صنعتی نمائش کے موقع پر نمائش کلب میں میوزیکل پروگرام پیش کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ گذشتہ ۱۲ سال سے جاری ہے۔ شعبۂ موسیقی کے اہم اراکین، خواجہ بہار الدین، عباس ہاشمی اور شکیل احمد ہیں، مرحوم محمد حسین نے بھی کافی دلچسپی لی۔ اسوسی ایشن کے بعض خصوصی پروگرام رویندرا بھارتی تھیٹر اور اندرا پریہ درشنی میں منعقد کیے جاچکے ہیں۔ ابتداء میں ہماری محفلیں سکریٹریٹ کے کمیٹی ہال میں منعقد ہوا کرتی تھیں لیکن اِدھر کچھ برسوں سے ہماری محفلیں مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں (باغ عامہ) منعقد ہو رہی ہیں۔ شروع شروع میں ہماری محفلوں میں سکریٹریٹ کے بہت سے اصحاب شریک ہوا کرتے تھے لیکن

اب سکریٹریٹ میں افسوسناک حد تک اُردو زبان اور اُردو شعر و ادب سے دلچسپی لینے والوں کی تعداد گھٹ چکی ہے۔ پھر بھی ہم نے اپنے عزائم کا چراغ جلائے رکھا ہے۔ ہم نے اسوسی ایشن کی بقا کے لئے کچھ خوشگوار تبدیلیاں لاتے ہوئے سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں اُن سابقہ اعلیٰ عہدہ داران سکریٹریٹ اور ملازمین کو بھی شامل کیا ہے جو اُردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی سرگرمیاں آج بھی جاری ہیں۔



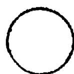
محفلِ خواتین

ڈسمبر ۱۹۷۱ء میں محفلِ خواتین کا قیام عمل میں آیا۔ حیدرآباد کی تعلیم یافتہ خواتین کی یہ ایک ادبی انجمن ہے جس کی روحِ رواں محترمہ عظمت عبدالقیوم تھیں۔ قیامِ انجمن ہی سے میں مشیر محفلِ خواتین کی حیثیت سے وابستہ ہوں۔ ان برسوں میں محفلِ خواتین نے غیر معمولی ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ محفلِ خواتین کے ادبی اجلاس ہر ماہ پابندی سے ہوتے ہیں جن میں شہر کی تعلیم یافتہ خواتین کے علاوہ کالجس اور یونیورسٹیوں کی طالبات نہ صرف شرکت کرتی ہیں بلکہ اپنی تخلیقات بھی پیش کرتی ہیں۔ محفلِ خواتین خالص علمی و ادبی انجمن ہے جس میں ہر مکتبِ خیال کی اہلِ قلم خواتین حصہ لے سکتی ہیں۔ اس محفل کے قیام کے بعد

کئی شاعرات اور خاتون ادیب منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ حیدرآباد کی تقریباً ۲۵ شاعرات کو اس محفلِ خواتین کا تعاون حاصل رہا ہے۔ محفلِ خواتین کو سارے ملک میں یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی شعری و ادبی انجمن ہے جس سے صرف خواتین وابستہ ہیں۔ اس محفل کو پروان چڑھاتے میں عظمت عبدالقیوم کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اس محفل کے زیر اہتمام تاحال ۵ ادبی میگزین شائع ہو چکے ہیں جن میں صرف خاتون اہلِ قلم کی تخلیقات شامل ہیں۔ عظمت عبدالقیوم کی زیرِ ادارت ۴ (چار) میگزین شائع ہو چکے ہیں، ۵ واں ادبی میگزین عظمت عبدالقیوم کے انتقال کے بعد معتمد محفلِ خواتین فاطمہ عالم علی خاں کی ادارت میں نکلا (شریکِ مدیر مظفر النساء ناز تھیں) اُن پانچ ادبی میگزین کا بنیادی کام (مسودات کی تصحیح و کتابت، پروف ریڈنگ، طباعت وغیرہ، عظمت عبدالقیوم کی نگرانی میں) بالراست میں نے انجام دیا ہے۔ محفلِ خواتین کے سالانہ جلسوں کے علاوہ بارش کی رات کے نام سے تاحال ۳ شبِ موسیقی کا عالیشان پیمانے پر اہتمام کیا۔ میں نے مشیرِ محفلِ خواتین کی حیثیت سے تمام سرگرمیوں کی مکمل نگرانی کی، ایسی تقاریب نہایت اہتمام کے ساتھ سرانجام پائیں۔ محفلِ خواتین کی سرگرمیوں اور اس کے طریقۂ کار کے تعین میں عظمت عبدالقیوم کے ساتھ میرا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ میں، محفلِ خواتین کی صورت گری اور اس کو سنوارنے میں عظمت عبدالقیوم کے دستِ راست کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ محفلِ خواتین آج بھی اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہے لیکن عظمت عبدالقیوم کی کمی کا ہر وقت احساس ہوتا ہے۔

محفلِ خواتین کا کوئی مسئلہ یا ادبی کام ایسا نہ تھا جو میرے مشورہ اور تعاون

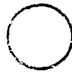
... پذیر تکمیل پاتا ہو۔ اس کا اطلاق عظمت عبدالقیوم کی زندگی تک رہا۔ عظمت عبدالقیوم کے بعد محفل خواتین سے میری دلچسپی بہت کم ہوگئی تھی لیکن جناب عابد علی خاں مدیر سیاست، معتمد محفل خواتین محترمہ فاطمہ عالم علی خاں اور شریک معتمد محفل خواتین مظفر النساء ناز کے اصرار پر تعاون کر رہا ہوں۔



شنکر جی میموریل سوسائٹی (کل ہند مشاعرے)

اگرچہ کہ میں شنکر جی میموریل سوسائٹی کا رکن نہیں ہوں لیکن جناب عابد علی خاں کی خواہش پر سوسائٹی کے پہلے مشاعرہ ہی سے وابستہ ہوں۔ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام تاحال ۱۶ کل ہند مشاعرے ہو چکے ہیں، جس طرح ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں کے سلسلہ میں وقف ہو کر صرف اُردو کی خدمت کے جذبہ سے کام انجام دیتا ہوں، اسی طرح سوسائٹی کے مشاعروں میں بھی میرا مکمل تعاون رہتا ہے۔ صدر سوسائٹی جناب عابد علی خاں کی مکمل نگرانی میں مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ سوسائٹی کے ذمہ دار اصحاب جب میری بے لوث خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں تو میری ساری تھکن دُور ہو جاتی ہے۔ سوسائٹی کے مشاعروں میں ملک بھر کے صفِ اول کے شعراء شرکت کرتے ہیں۔ جناب محی الدین جیلانی سوسائٹی کے سکریٹری ہیں۔ یہ مشاعرے ہر سال ممتاز عثمانین جناب شنکر جی کی یاد میں نمائش میدان میں

منعقد ہوتے ہیں۔ ان کے فرزند مسٹر شریدر اور ان کے دو بہترین دوست محی الدین جیلانی اور کے۔ ایس۔ ریڈی نے شنکر جی کی خدمات کو خراج پیش کرنے کے لئے سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور مشاعروں کا آغاز کیا۔ (شنکر جی جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں میں سے ایک تھے اور جنھیں اُردو شعر و ادب سے بے حد دلچسپی تھی)۔



انجمن ترقی پسند مُصنّفین

حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بھی ایک اہم تاریخ رہی ہے۔ اس انجمن سے بہت سے ممتاز دانشور، شاعر و ادیب وابستہ رہے ہیں۔ انجمن کے احیاء سے پہلے ڈاکٹر حسینی شاہد انجمن کے معتمد عمومی تھے۔ ۱۷ سال کے تعطل کے بعد ڈاکٹر حسینی شاہد سکریٹری انجمن نے ۱۱ر جون ۱۹۸۷ء کو اُردو ہال میں حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کا ایک اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں ایک اڈہاک کمیٹی زیر سرپرستی ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ڈاکٹر حسینی شاہد بنی۔ کنوینر کی حیثیت سے جناب راشد آذر کا اور شریک کنوینر کی حیثیت سے میرا انتخاب عمل میں آیا۔ اجلاس کی بڑی تعداد یہ چاہتی تھی کہ میں کنوینر بنوں، چنانچہ میرا نام مختلف دانشوروں نے پیش کیا لیکن میں نے ترجیحاً راشد آذر کا نام تجویز کیا۔ راشد آذر نے انکار کیا اور کہا کہ مجھ سے تنظیمی کام انجام دینا ممکن نہیں ہے۔ میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ آپ ہاں

کہہ دیجیئے انجمن کی ساری ذمہ داری میں سنبھال لوں گا۔ دو ماہ بعد جب ۱۷ر جولائی ۱۹۸۷ء کو انتخابات ہوئے تو ہم دونوں بلا مقابلہ دو سال کی مدت کے لئے معتمد اور شریک معتمد منتخب ہوئے۔ جب دو سال کے بعد ۲۹ر جولائی ۱۹۸۹ء کو پھر انتخابات ہوئے تو اراکین نے ہم دونوں کو ان ہی عہدوں پر برقرار رکھا۔ عابد علی خاں مدیر سیاست، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ڈاکٹر حسینی شاہد سرپرست بنے، جناب عاتق شاہ صدر کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ محترمہ نجمہ نکہت اور جناب رحمن جامی نائب صدور، جناب رئیس اختر معتمد نشر و اشاعت اور جناب گیان سنگھ شاطر خازن مقرر ہوئے۔ زائد از ۴ برس سے انجمن ترقی پسند مصنفین نہایت پابندی سے کام کر رہی ہے۔ ابتداء میں انجمن کے جلسے ایوان اردو ہال میں ہوا کرتے تھے لیکن اردو ہال میں سامعین کی تعداد حوصلہ افزاء نہیں تھی جس کی وجہ سے ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں جلسوں کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ انجمن کے جلسے پابندی کے ساتھ مہینے میں دو بار ہوتے ہیں۔ حیدرآباد کی یہ پہلی ادبی انجمن ہے جس کے جلسے وقت پر شروع ہوتے ہیں۔ انجمن کی رکنیت کے لئے ہم نے کوئی خاص شرط نہیں رکھی لیکن اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ایسا شخص رکن بنے جو زندگی کی مثبت قدروں کی پاسداری کرتا ہو۔

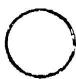
انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل جدید کے وقت بلا کسی ذہنی تحفظات کے ہر اس شاعر و ادیب کو انجمن میں شامل کرنا طئے پایا جو نہ صرف روشن خیال ہو بلکہ جس کی تخلیقات میں زندگی کی حرارت ہو اور جس کے قلم میں اتنی طاقت ہو کہ وہ سچائی کی آواز کو بلا خوف و خطر بلند کر سکے۔ جب انجمن کا احیاء ہوا تو بعض دانشوروں کا یہ خیال تھا کہ یہ انجمن زیادہ دنوں تک نہیں چل سکے گی۔ ہم نے انجمن

کو ذاتی جھگڑوں، غیر اُصولی اور نزاعی باتوں سے دور رکھا ہے۔ ہماری انجمن کے جلسوں میں تخلیقات پر تنقید و تبصرہ کی روایت برقرار ہے۔ نہایت دوستانہ ماحول میں انجمن کے جلسے کامیابی کے ساتھ منعقد ہوتے ہیں۔ راشد آزر اور میرے مزاج میں ہم آہنگی ہے۔ کسی بھی تنظیمی مسئلہ پر اختلاف رائے نہیں ہوتا جس کی وجہ سے نہایت سکون کے ساتھ انجمن کی سرگرمیوں میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت دے رہا ہوں۔ قیام انجمن ہی سے انجمن کے تمام جلسوں کی کارروائی میں ہی چلاتا ہوں۔ اخبارات کے لئے انجمن کی نیوز بنانے اور شائع کروانے کا انتظام کرنا میرے ہی ذمہ ہے۔ ہم نے اپنی بہترین اور غیر نزاعی کارکردگی سے اپنے اراکین کو اپنے اعتماد میں لے لیا ہے، اس لئے اراکین نے کبھی بھی ہمارے موقتی فیصلوں کی مخالفت نہیں کی۔ اردو کے نامور دانشور جب ہمارے شہر کو اپنے علمی و ادبی کام کے سلسلہ میں آتے ہیں تو مناسبت اور موزونیت کے لحاظ سے انجمن کی جانب سے ان کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ موقتی تقاریب کے انعقاد کے بارے میں ہم دونوں فون پر مشورہ کرنے کے بعد جلسوں کے اہتمام کو عملی شکل دیتے ہیں۔ انجمن کے صدر ممتاز افسانہ نگار جناب عاتق شاہ بھی انجمن کی سرگرمیوں میں اضافہ کے لئے مفید مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں، وہ معتمد اور شریک معتمد کی سرگرمیوں میں کبھی حائل نہیں ہوتے۔ ہم نے کبھی بھی اپنے اراکین کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔

جب انجمن بنی تو بعض اصحاب کا یہ خیال تھا کہ یہ انجمن سابقہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی نہج پر چلتی رہے گی اور ترقی پسند مصنفین کے بارے میں جو متنازعہ باتیں ہیں، ہم اُن کی حوصلہ افزائی کریں گے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم نے

کھلے ذہن اور فراخ دلی کے ساتھ انجمن کے دروازے ہر اُس شاعر و ادیب کیلئے کھلے رکھے جو ادب برائے زندگی کا قائل ہے۔ انجمن کی خبریں مقامی اخباروں، سیاست، منصف، رہنمائے دکن کے علاوہ حیات (دہلی)، ہماری زبان (دہلی) اور ملک کے دوسرے اُردو اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

ہم نے ۲۱ر ۲۲ر جنوری ۱۹۸۹ء کو انجمن کی سالانہ کانفرنس منعقد کی تھی۔ جس میں علی سردار جعفری، ڈاکٹر قمر رئیس اور راجیو سکسینہ کے علاوہ ممتاز دانشور سید عابد حسین (موجودہ سفیر برائے امریکہ) نے شرکت کی تھی۔ یہ کانفرنس نہایت کامیاب رہی۔ اس موقع پر ایک ادبی سوونیر شائع کیا گیا تھا جس کا مدیر میں تھا۔ یقین ہے کہ انجمن کی سرگرمیاں اسی طرح ارتقائی منازل طے کرتی رہیں گی۔ اگست ۱۹۹۱ء کو انجمن کے انتخابات ہوئے جس میں تیسری دفعہ شریک معتمد کی حیثیت سے میرا انتخاب عمل میں آیا۔



دیارِ ادب

دیارِ ادب ضلع بیدر (کرناٹک) کی ایک قدیم ادبی انجمن ہے جس کے بانی و صدر ممتاز شاعر جناب رئیس اختر ہیں۔ گذشتہ ۶، ۷ سال سے اس انجمن کی سرگرمیاں بیدر کے بجائے حیدرآباد میں جاری ہیں۔ میں اس انجمن کا مشیر ہوں اور ممتاز شاعر جناب متان منظور معتمد عمومی ہیں۔ دیارِ ادب کی کارکردگی کا

انداز شہر کی دیگر انجمنوں کے مقابلے میں بالکل مختلف ہے۔ اس انجمن کی جانب سے وقتاً فوقتاً بیرون ملک اور بیرون ملک کے ممتاز اہل قلم حضرات کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اس انجمن کی جانب سے حسن چشتی (شکاگو) ڈاکٹر توفیق احمد (امریکہ) جناب فضل الدین فضل (امریکہ) اور اندرون ملک میں مسٹر ملہوترا ای۔جی۔پی شملہ کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس انجمن کی ساری سرگرمیوں میں میری عملی جدوجہد کا بڑا دخل رہتا ہے۔ جلسوں کا اہتمام، تشہیر وغیرہ میرے ذمے رہتی ہے۔ ہم تینوں نہایت خلوص کے ساتھ اس انجمن کی کارکردگی کو پروان چڑھانے میں ہم خیال ہیں۔



جشن گولکنڈہ سوسائٹی

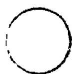
حیدرآباد کی (۴۰۰) سالہ جشن تقاریب کے سلسلہ میں دو سال قبل جشن گولکنڈہ سوسائٹی بن چکی ہے۔ جس کی سرپرست سابق گورنر شریمتی کمودینی جوشی تھیں، اس وقت ریاست کے موجودہ گورنر جناب کرشن کانت سوسائٹی کے سرپرست ہیں۔ نواب شاہ عالم خاں صدر، جناب عابد علی خاں کارگزار صدر، ڈاکٹر موہن لال نگم سکریٹری، صلاح الدین نیر جوائنٹ سکریٹری اور غلام احمد خازن ہیں۔ ان کے علاوہ بعض ممتاز شخصیتیں اراکین کی حیثیت سے وابستہ ہیں، جن میں

قابل ذکر ڈاکٹر سی نارائن ریڈی وائس چانسلر تلگو یونیورسٹی، پروفیسر نونیت راؤ وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ، جناب امجد علی خان سکریٹری نظامس ٹرسٹ، جناب سید تراب الحسن، جناب معظم حسین، مسٹر دی وی شاستری ڈائرکٹر آکاش وانی حیدرآباد، جناب منوہر راج سکسینہ، یم چیتر نجن، آر شادت، بلقیس علاءالدین وغیرہ ہیں۔ اس سوسائٹی کے قیام کے سلسلے میں سابقہ گورنر شریمتی کمودینی جوشی نے تین سال قبل یوم قلی قطب شاہ کے افتتاحی جلسہ میں یہ مشورہ دیا تھا کہ حیدرآباد کی (٤٠٠) سالہ جشن تقاریب منائی جائیں، انہوں نے عابد علی خان صاحب اور ڈاکٹر موہن لال نگم سے خواہش کی تھی کہ وہ اس سلسلہ میں اُن سے ملیں۔ شروعات کے طور پر انہوں نے (۵) ہزار روپے عطیہ کا اعلان کیا تھا۔

سوسائٹی کی جانب سے تاحال دو بڑی تقاریب (کل ہند مشاعرہ) اور شب غزل کا اہتمام کیا جاچکا ہے۔ یہ تقاریب مالیہ کے استحکام کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھیں۔ ان دونوں تقاریب کے انعقاد کا سہرا جناب عابد علی خان کی مشاورت اور ڈاکٹر نگم کی شخصی دلچسپی کے سر جاتا ہے۔ یہ دونوں تقاریب مسٹر پیترنجن (ای۔ٹی۔ای) کے بھرپور تعاون سے منعقد ہوسکیں۔ آئی ٹی اے نے ان دونوں پروگرامس کو اسپانسر کیا تھا، جس میں سوسائٹی کو ۳½ لاکھ روپے ملے۔ خاص طور پر مشاعرہ کے انعقاد کے سلسلے میں صرف نگم صاحب اور میری شخصی دلچسپی رہی۔ تمام شعراء کو میں نے ہی مدعو کیا تھا، خط وکتابت کی اور ضروری انتظامات کیے لیکن یہ سب کچھ ڈاکٹر نگم کی مشاورت اور تعاون سے ممکن ہوسکا۔ کل ہند مشاعرہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو قلی قطب شاہ اسٹیڈیم میں منعقد کیا گیا جس میں ملک کے نامور

شعراء ڈاکٹر گوپال داس نیرج، بیکل اُتساہی، ڈاکٹر احسن رضوی، پروفیسر آزاد گلاٹی نے بھی شرکت کی تھی۔ اس مشاعرہ میں ۱۸ بیرونی شعراء کو مدعو کیا گیا تھا۔ دوسرا پروگرام شبِ غزل کا تھا جو رویندرا بھارتی تھیٹر میں جنوری ۱۹۹۰ء میں ہوا۔ پاکستان کے نامور گلوکار غلام علی کو مدعو کیا گیا تھا۔ سوسائٹی کی جانب سے سال بھر کا پروگرام ترتیب دیا ہی جا رہا تھا کہ گورنر صاحبہ نے راج بھون میں ایک میٹنگ طلب کی اور یہ تجویز رکھی کہ جب حکومت نے جشن منانے کا اعلان کیا ہے تو بہتر یہ ہے کہ سوسائٹی کے کچھ اراکین چیف منسٹر صاحب (ڈاکٹر ایم چنا ریڈی) سے مل لیں اور جشن کی صورت گری کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور اپنا تعاون پیش کریں۔ چنانچہ طے پایا کہ جناب عابد علی خاں، نواب شاہ عالم خاں اور ڈاکٹر نگم چیف منسٹر صاحب سے مل لیں۔ اس سلسلے میں سوسائٹی کے اراکین نے حکومت کے نمائندہ جناب نریندر لوتھر صاحب سے ملاقاتیں کیں، دو، تین میٹنگس بھی ہوئیں۔ چیف منسٹر صاحب نے مشاورت کے لئے ایک بڑے اجلاس کا اہتمام کیا تھا، لیکن جشن کے افتتاح کی قطعی تاریخ مقرر نہ کی جاسکی۔ پھر آندھرا علاقہ میں طوفانِ بادوباراں اور دیگر انتشاری حالات کی وجہ سے کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ حکومت کا یہ خیال تھا کہ جنوری ۱۹۹۱ء سے تقاریب کا آغاز کیا جائے لیکن شہر میں فسادات کی وجہ سے حکومت بدل گئی اور یہ ممکن نہ ہو سکا۔ جشن کے کام کو آگے بڑھانے کے لئے ۲۲ر ڈسمبر کو ۱۰/۱۲ بجے دن راج بھون میں ایک تعارفی اور مشاورتی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت گورنر آندھرا پردیش جناب کرشن کانت نے کی۔ اراکین کی خواہش پر گورنر صاحب نے سوسائٹی کی سرپرستی قبول کی۔ یہ طے پایا کہ جشن کی

تقاریب' کا آغاز سوسائٹی کی جانب سے اپنے طور پر کیا جائے اور حکومت کی تقاریب میں بھی تعاون کیا جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ حکومت جلد ہی تقاریب کا آغاز کرنے والی ہے لیکن پتہ نہیں وہ خوش نصیب دن کون سا ہوگا۔



مشاعرۂ دکن

کئی برسوں سے ادبی حلقوں میں یہ بات شدت سے محسوس کی جارہی تھی کہ ایسے ممتاز شعراء جو ریاستوں کی تقسیم سے پہلے حیدرآباد دکن سے تعلق رکھتے تھے اور ایسے ممتاز شعراء جو آندھرا پردیش کے اضلاع میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، انہیں حیدرآباد کے مشاعروں میں مدعو کیا جاتا رہے۔ اس جذبہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۱۹۸۹ء سے زیر سرپرستی مجاہد آزادی ہند سابق وزیر اطلاعات حکومت آندھرا پردیش جناب کونڈہ لکشمن باپو جی' مشاعرہ کا آغاز کیا گیا۔ مشاعرۂ دکن کے انعقاد کے سلسلے میں جناب کونڈہ لکشمن باپو جی نے مجھ سے ایک ملاقات میں کہا تھا کہ میں عید رمضان کے موقع پر قومی یکجہتی کو پروان چڑھانے اور حیدرآبادی تہذیب کو خراج پیش کرنے کے لئے ہر سال ایک نمائندہ مشاعرہ کرنا چاہتا ہوں۔ حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کی دیرینہ روایات کی تجدید کے لئے میں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ میں اس سلسلہ میں ایک ٹرسٹ بھی بنانا چاہتا ہوں' جس میں آپ کا

تعاون درکار ہے۔ مشاعروں کے انعقاد کی ساری ذمہ داری آپ پر رہے گی۔ اور آپ مشاعرۂ دکن کے مستقل معتمد رہیں گے۔

میں نے کوندہ لکشمن باپوجی کے اس جذبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس بہتر اور مفید کام میں دلچسپی لینا شروع کیا۔ چنانچہ مشاعرۂ دکن کا پہلا مشاعرہ ۸/ مئی ۱۹۸۹ء کو، عید رمضان کے دوسرے دن حسین ساگر کے پُرفضا کنارے پر شاندار پیمانے پر منعقد کیا گیا جس کی صدارت جناب عابد علی خان نے کی، مہمان خصوصی کی حیثیت سے جسٹس سردار علی خاں جج آندھرا پردیش ہائی کورٹ نے شرکت کی تھی۔ اس مشاعرہ میں سابق ریاست حیدرآباد اور آندھرا پردیش کے اضلاع کے شاعروں کے علاوہ حیدرآباد کے اُردو، ہندی، تلگو کے نمائندہ شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس مشاعرہ میں اضلاع کے ۲۵ نمائندہ شاعروں نے شرکت کی تھی۔ مشاعرہ دکن کا دوسرا مشاعرہ ۱۲/ مئی ۱۹۹۰ء کو منعقد ہوا جس کی صدارت جناب عابد علی خان نے کی۔ اس مشاعرہ میں شعراء کا استقبال کرتے ہوئے انہیں محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے خوبصورت اسکیچ پر مبنی نرمل انڈسٹری کا تیار کردہ مومنٹو پیش کیا گیا۔ اس مشاعرہ کو ۴۰۰ سالہ جشن حیدرآباد سے منسوب کیا گیا۔ مشاعرہ کے انعقاد کا ایک واضح مقصد یہ ہے کہ حیدرآباد کی تہذیبی روایات کی جس کو سارا ملک رشک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے، پاسداری کی جائے اور نئی نسل کو یہ بتایا جائے کہ اُن کے اسلاف کس طرح گنگا جمنی ماحول میں رہتے تھے۔

ان مشاعروں کی وجہ سے حیدرآباد میں ایک خوشگوار فضاء نے جنم لیا ہے۔ مشاعروں میں اُردو، ہندی اور تلگو کے نمائندہ شاعروں کے ساتھ ساتھ بعض باصلاحیت نئے

شاعروں کو بھی مدعو کیا جاتا ہے تاکہ انہیں یہ احساس نہ ہو کہ اُن کی صلاحیتوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

تیسرا مشاعرۂ دکن ۱۴ر مئی ۱۹۹۱ء کو شب جلادریشم میں منعقد ہوا۔ گورنر آندھرا پردیش جناب کرشن کانت نے افتتاح کیا اور تمام (۶۰) شاعروں کو مومنٹو پیش کئے۔ جناب عابد علی خان نے صدارت کی۔ مہمانانِ خصوصی میں جسٹس سردار علی خان، ڈی۔ راما راؤ، ڈاکٹر سید عبدالمنان اور جناب متو ہر راج سکسینہ شامل تھے۔



اُولڈ سٹی یوتھ فسٹیول

حکومت کی سطح پر زیر اہتمام قلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی ۴ر، ۵ر مارچ ۱۹۹۰ء کو قلی قطب شاہ اسٹیڈیم میں شاندار پیمانے پر اولڈ سٹی یوتھ فسٹیول منایا گیا، جس کا میں سکریٹری مقرر کیا گیا۔ گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ تلگو کے عظیم شاعر پدم شری ڈاکٹر سی نارائن ریڈی وائس چانسلر تلگو یونیورسٹی، فسٹیول کے مشیر اعلیٰ تھے۔ مجھے سکریٹری مقرر کرنے میں اُن کی شخصی دلچسپی کو دخل رہا ہے۔ مسٹر نرسمہا راؤ ڈائرکٹر کلچرل افیرس، اڈوائزر اور مسٹر کے۔ رمنا چاری آئی اے ایس، ایڈمنسٹریٹر قلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ

اتھارٹی اعزازی چیرمین تھے۔ پروگرام کی بہتر انجام دہی کے لئے میں نے مختلف شعبوں کی سب کمیٹیاں بنائیں۔ ڈاکٹر صادق نقوی، سمینار کے انچارج رہے۔ خواجہ بہاء الدین اور اسلم فرشوری شعبۂ موسیقی اور کلچرل ونگ کے کنوینرس تھے، رئیس اختر اور نہپال سنگھ ورما مشاعرہ کے کنوینر رہے۔ ۵ر مارچ کی شب اُردو ہندی کا شاندار مشاعرہ زیر صدارت جناب عابد علی خاں منعقد کیا گیا تھا جس میں اُردو، ہندی کے ۲۸ نامور و نمائندہ شاعروں نے کلام سنایا۔ ان تمام شاعروں کا سنمان کیا جاکر انہیں ایک یادگار مومنٹو دیا گیا اور شال اوڑھائی گئی۔ جناب تاج الدین سکریٹری اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی، فیسٹول کے خازن تھے، جنھوں نے پروگرام کے انتظامات میں مکمل تعاون کیا۔ یہ فیسٹول فیبروری کے آخری ہفتہ میں منعقد ہونے والا تھا لیکن میرے بیرون ملک سفر کی وجہ سے (۴۰۰ سالہ جشن حیدرآباد تقاریب جدہ) ملتوی کیا جاکر مارچ میں رکھا گیا۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی اور مسٹر رمنا چاری چاہتے تھے کہ پرانے شہر کا یہ فیسٹول میری موجودگی میں ہو۔ سہ روزہ تقاریب اعلیٰ پیمانے پر منائی گئیں۔ پرانے شہر میں اس فیسٹول کے انعقاد کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ پرانے شہر کے لوگ جو نئے شہر کے تہذیبی مراکز پر مشکل سے پہنچ پاتے تھے ان کے ذوق کی تکمیل ہو۔ میں نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں کہا تھا کہ جب تک ہمارے شہر میں ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی اور مسٹر رمنا چاری جیسے سیکولر ذہنیت کے لوگ موجود ہیں ہمارے شہر میں، اس قسم کی مقصدی شعری، تہذیبی اور ادبی تقاریب منعقد کی جاتی رہیں گی۔ میں نے لسانی ہم آہنگی کے جذبہ کو فروغ دینے کیلئے مشاعرہ میں اردو شاعروں کو مدعو کرنے کیلئے نہپال سنگھ ورما سے خواہش کی اور ہندی شاعروں کو کلام سنانے کیلئے رئیس اختر سے کہا تھا۔

میرا شہر میرے لوگ

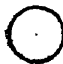
"میرا شہر میرے لوگ" ایک ادبی و تہذیبی ادارہ ہے جس کی سرگرمیوں کا آغاز حکومت آندھرا پردیش کے شعبہ تہذیبی و ثقافتی اُمور اور خاص طور پر ڈائرکٹر کلچرل افیرس مسٹر ویناٹ رمنا چاری کی شخصی دلچسپی کی وجہ سے اُردو، ہندی کے ملے جُلے مشاعرہ سے ہوا، جو ماہ مئی ۱۹۹۱ء کی شب، مال والا پیالیس میں منعقد ہوا تھا۔ جناب عابد علی خان مدیر سیاست نے صدارت کی تھی۔ اس مشاعرہ میں اُردو، ہندی کے نمائندہ شاعروں کا سنمان کیا جاکر انہیں شال اوڑھائی گئی۔ اِس ادارہ کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس کی جانب سے شہر میں وقتاً فوقتاً ادبی و تہذیبی تقاریب منعقد کی جاتی رہیں۔

اس ادارہ کی جانب سے عارف قریشی (جدہ) کے اعزاز میں بمقام طارق منزل، نورخاں بازار ایک یادگار مشاعرہ ہوا جس میں اُردو، ہندی کے نمائندہ شاعروں نے کلام سُنایا۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد صدر نشین اقلیتی کمیشن مہمانِ خصوصی تھے۔ جناب امیر احمد خسرو نے صدارت کی تھی۔ اس مشاعرہ کا ویڈیو کیسٹ تیار کیا گیا۔ معتمدی کے فرائض میں نے انجام دیئے۔

ادارہ کی دوسری تقریب حیدرآباد کے ایک کہنہ مشق اُستاد شاعر

جناب مسعود صدیقی کی یاد میں   کو مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت جناب راشد آذر نے کی تھی جبکہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مسرز امیر احمد خسرو، رئیس اختر، رحمٰن جامی اور شاہد صدیقی شاہد (کنیڈا) نے شرکت کی تھی۔ ہال ولا پیالیس کے مشاعرہ کی طرح اس تقریب کا بھی میں کنوینر تھا۔ اجلاس کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں شہر کے نمائندہ شعراء نے کلام سُنایا تھا۔

۶ر ستمبر ۱۹۹۱ء کو اس ادارہ کی جانب سے بہ تعاون محکمہ تہذیبی و ثقافتی امور حکومت آندھرا پردیش، رویندرا بھارتی میں اعلیٰ پیمانے پر "شامِ غزل" کا اہتمام کیا گیا تھا، جس کی صدارت ڈاکٹر سید عبدالمنان نے کی جبکہ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر موہن لال نگم اور جناب سعد حسین سعد نے شرکت کی۔ ممتاز گلوکار ڈاکٹر جگدیش کلّو پروگرام انچارج تھے۔ مسرز حمایت اللہ اور خواجہ بہاء الدین معاون انچارج، صلاح الدین نیّر سکریٹری کنوینر شامِ غزل اور جناب رئیس اختر معاون تھے۔ ڈاکٹر جگدیش کلّو، دیوی رتنا مورتی، مالا بہاریہ، کلیم خاں اور خالد اطہر نے حیدرآباد کے بقیدِ حیات نمائندہ شعراء کا کلام سُنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ جناب اسلم فرشوری نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ ابتداء میں راقم الحروف نے خیر مقدمی و تعارفی تقریر کی۔



شعری مجموعے

اب تک میرے (۸) شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے
گُلِ تازہ (۱۹۶۵ء)، زخموں کے گلاب (۱۹۷۲ء)، صنم تراش (۱۹۷۸ء)،
شکن در شکن (۱۹۷۹ء)، خوشبو کا سفر (۱۹۸۳ء)، رشتوں کی مہک (۱۹۸۶ء)،
سفر جاری ہے (۱۹۸۸ء)، یہ کیسا رشتہ ہے (۱۹۹۰ء)۔

"سفر جاری ہے" میں میری (۳۵۰) منتخب غزلیں شامل ہیں۔ اس مجموعے میں میرے پہلے مجموعوں میں شامل منتخب غزلوں کے علاوہ کچھ نئی غزلیں بھی شریک ہیں۔ بہت سی پچھلی غزلوں پر میں نے نظر ثانی بھی کی ہے۔

اسی طرح "یہ کیسا رشتہ ہے" میں منتخب نعتیں، ایک فارسی منقبت کے علاوہ مختلف موضوعات پر نظمیں شریک ہیں۔ یہ مجموعہ ۳۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں میری تمام شاعرانہ زندگی کی منتخب مطبوعہ نظموں کے علاوہ چند غیر مطبوعہ نظمیں بھی شامل ہیں۔ میرے کلام کا ایک اور مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

میرے مجموعۂ کلام "گلِ تازہ" کی منتخب غزلوں پر مشتمل تلگو منظوم مجموعہ "[illegible] گیتالو" کے نام سے [illegible] ساہتیہ [illegible] پریشد [illegible] ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا جس کا منظوم ترجمہ جناب شمس الدین تموری(؟) نے کیا ہے۔ یہ کتاب ممتاز شاعر [illegible] سابق [illegible] کی شخصی دلچسپی سے شائع ہوئی تھی۔

نثری کتابیں اور شعری مجموعے

ترتیب و تزئین

۱۔ عظمتِ غزل (عظمت عبدالقیوم فن اور شخصیت، مرتبہ صلاح الدین نیّر) ۱۹۸۸ء

۲۔ عظمتِ خیاباں (عظمت عبدالقیوم) مضامین، افسانے، شاعری، خطوط اور متفرق تحریریں (مرتب: صلاح الدین نیّر) ۱۹۸۹ء

۔۔ زیر نگرانی شائع شدہ کتابیں ۔۔

۱۔ اُردو ادب میں خاکہ نگاری ۔ ڈاکٹر صابرہ سعید ۔ ۱۹۶۹ء

۲۔ ارمغانِ اختر (شاعری) اختر فاروقی ۔ ۱۹۷۵ء

۳۔ ادبی میگزین (سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن) ۔ ۱۹۷۶ء

۴۔ بہارِ غزل (شاعری) ۔ اقبال حسین اقبالؔ ۔ ۱۹۷۹ء

۵۔ گھر کی دیوار ۔ (افسانے) انیس قیوم فیاض ۱۹۸۰ء

۶۔ حیدرآباد میں اُردو افسانہ نگاری ۔ انیس قیوم فیاض ۱۹۸۰ء

۷۔ آل احمد سرور اور ادبی خدمات ۔ عابد النساء ۱۹۸۰ء

۸۔ جانِ غزل ۔ (شاعری) ۔ اقبال حسین اقبالؔ ۱۹۸۰ء

۹۔ جامِ کوثر ۔ (شاعری) ۔ اقبال حسین اقبالؔ ۱۹۸۱ء

۱۰۔ زخم بولتے ہیں (شاعری) ۔ ہیرالال موریا ۱۹۸۲ء

۱۱۔ بھگوان رام (اجودھیا کھانڈ) (شاعری) ہیرالال موریا ۱۹۸۳ء

۱۲۔ حیدرآباد کے علمی و ادبی ادارے ۔ شفیع قادری ۱۹۸۳ء

۱۳۔ بات پھولوں کی (شاعری) ۔ مظفر النساء ناز ۱۹۸۳ء

۱۴۔ پسِ دیوارِ شب (شاعری) ۔ سکندر محسن ۱۹۸۴ء

۱۵۔ تعارف (مضامین) ۔ شفیع قادری ۱۹۸۵ء

۱۶۔ بھگوان رام (آسیہ کھانڈ) (شاعری) ہیرالال موریا ۱۹۸۶ء

۱۷۔ سوزِ قمر (شاعری) انجم قمر سوز ۱۹۸۶ء

۱۸۔ ادبی میگزین (انجمن ترقی پسند مصنفین) ۱۹۸۹ء

۱۹۔ پہچان (شاعری) ۔ کویتا کرن ۱۹۸۹ء

۲۰۔ رامائن ۔ یدھ کھانڈ ہیرالال موریا ۱۹۹۱ء

شعری [illegible]ول پر انعامات

۱۔ زخموں کے گلاب ۔ اترپردیش اردو اکیڈیمی ۱۹۷۳ء

۲۔ شکن در شکن ۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی ۱۹۸۰ء

۳۔ خوشبو کا سفر ۔ اترپردیش اردو اکیڈیمی، بہار اردو اکیڈیمی، آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی ۱۹۸۴ء

۴۔ رشتوں کی مہک ۔ اترپردیش اردو اکیڈیمی، بہار اردو اکیڈیمی، اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش ۱۹۸۷ء

۵ - مغربی بنگال اُردو اکیڈمی ' اُتر پردیش اُردو اکیڈمی ۔ سفر جاری ہے
اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش ۔ ۱۹۸۹ء

۶ - یہ کیسا رشتہ ہے ۔ اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش ۱۹۹۰ء

شعری ' ادبی و تہذیبی خدمات کے اعتراف میں اعزازات

۱ - پوئٹری ایوارڈ ۔ آندھرا پردیش کلچرل اسوسی ایشن سکریٹریٹ ۔ ۱۹۶۷ء
۲ - پوئٹ آف انٹگریشن ایوارڈ ۔ ضلع گرندھالیہ سمستھا کھمم ۔ ۱۹۸۲ء
۳ - یونٹی ایوارڈ ۔ یونائٹیڈ ہندو مسلم فرنٹ ' حیدرآباد ۔ ۱۹۸۵ء
۴ - نیشنل انٹگریشن ایوارڈ ۔ بھارتیہ کلچرل اکیڈمی ' آندھرا پردیش ۔ ۱۹۸۸ء
۵ - شانِ حیدرآباد ایوارڈ ۔ حیدرآباد آرٹس اینڈ ... سوسائٹی ۱۹۸۸ء
۶ - قلی قطب شاہ ایوارڈ ۔ (مومنٹو) اولڈ سٹی یوتھ فیڈریشن ۱۹۹۰ء
۷ - مشاعرہ دکن ایوارڈ ۔ (مومنٹو) ۔ مجاہد آزادی لونڈا لکشمن باپوجی ...
۸ - مشاعرہ دکن ایوارڈ ۔ (مومنٹو) ۔ مجاہد آزادی کونڈا لکشمن باپوجی ۱۹۹۱ء
۹ - فخرالدین علی احمد قومی یکجہتی ایوارڈ ۱۹۹۱ء

محولہ بالا ایوارڈز کے علاوہ حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے مختلف تقاریب اور مشاعروں کے موقع پر کئی مرتبہ سنمان کیا گیا ۔ شال اور نشان بھی ' سرٹیفیکٹس دیئے گئے اور مجھے مومنٹو پیش کیے گئے ۔

ملک اور بیرون ملک کے مشاعرے

اور دیگر تفصیلات

دوحہ قطر: ... شیخ خلیفہ بن حمد الثانی کے ۲۶ ویں یوم جلوس کے موقع پر ۱۷ فروری ۱۹۸۸ء کو دوحہ قطر میں مشاعرہ منعقد ہوا تھا، جس میں حیدرآباد کی نمائندگی میں نے کی تھی۔ ملک کے شاعروں میں علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، حفیظ میرٹھی، شمس الرحمٰن فاروقی، ملک زادہ منظور، وسیم بریلوی کے علاوہ پاکستان کے نامور شاعر حمایت علی شاعر اور منور ہاشمی نے شرکت کی تھی۔ مشاعرہ کے دوسرے دن دوحہ قطر ریڈیو اسٹیشن میں بھی مشاعرہ منعقد ہوا تھا، جس میں تمام مہمان شعراء نے کلام سنایا تھا۔

جدہ: حیدرآباد کی (۴۰۰) سالہ جشن تقاریب کے سلسلے میں زیر اہتمام (۴۰۰) سالہ جشن حیدرآباد کمیٹی جدہ، ۴؍ فروری تا ۲۳؍ فروری ۱۹۹۰ء افتتاحیہ جلسہ، سمینار، کلچرل پروگرام اور مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ مشاعرہ میں میرے علاوہ مسرز حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، یونس حیدرآبادی، علی الدین نوید، طالب خوندمیری، نریندر لوتھر، رام سوامی اور صبغۃ اللہ بمباٹ نے کلام سنایا۔
جناب عابد علی خان مدیر سیاست کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست نے شرکت کی تھی۔
افتتاحیہ اجلاس کو جناب سلطان صلاح الدین اویسی صدر کل ہند مجلس اتحاد المسلمین ...

ایم پی۔ جناب عابد علی خان، جناب سید ہاشم علی اختر سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور نیشنل اوقاف ... اور جناب طارق غازی وغیرہ نے مخاطب کیا۔

ریاض: ۱۹۹۰ء حیدرآباد کی ۴۰۰ سالہ جشن تقاریب کے سلسلے میں ۲۶ فروری کو ریاض میں مقیم حیدرآبادیوں کی جانب سے رنگا رنگ تقاریب کے علاوہ مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا تھا، جس میں میرے علاوہ مسز حمایت اللہ، جناب خوند میری، مصطفیٰ علی بیگ اور یوسف حیدرآبادی نے شرکت کی تھی۔ صدارت جناب سید ہاشم علی اختر نے کی تھی۔

کویت: کویت میں مقیم حیدرآبادیوں کے تعاون سے حیدرآباد کی ۴۰۰ سالہ جشن تقاریب کے سلسلے میں جشن حیدرآباد کمیٹی کویت کی جانب سے ۱۷ اور ۱۸ مئی ۱۹۹۰ء کو جشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا، جس کی صدارت جناب عابد علی خان مدیر سیاست نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے صدر کل ہند مجلس اتحاد المسلمین جناب سلطان صلاح الدین اویسی نے شرکت کی تھی۔ مشاعرہ میں میرے علاوہ مسز حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، ڈاکٹر موہن لال نگم، خواہ مخواہ (بمبئی) نے شرکت کی تھی۔ ان تقاریب کے روح رواں جناب ہوشدار خان تھے۔



زائد از ۴۰ سال سے کل ہند مشاعرے پڑھتا رہا ہوں۔ میں نے حیدرآباد میں

پہلا کل ہند مشاعرہ ۵ دسمبر ۱۹۵۹ء میں پڑھا تھا، جو حیدرآباد کلچرل سوسائٹی کی جانب سے گاندھی بھون میں منعقد ہوا تھا، جس کے کنوینر اکمل حیدرآبادی تھے۔ مشاعرہ میں تسلیم گوالیاری، شکیل بدایونی، انور مرزاپوری اور حسرت جے پوری نے شرکت کی تھی۔ دوسرا کل ہند مشاعرہ نمائش گراؤنڈ میں ۱۶ مئی ۱۹۶۰ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرہ کے کنوینر بھی اکمل حیدرآبادی تھے۔ مخدوم محی الدین صاحب نے مشاعرہ کی صدارت کی تھی۔ مہمان شعراء میں شکیل بدایونی، راز الہ آبادی اور شعری بھوپالی شامل تھے۔ حیدرآباد کے شاعروں میں میں بھی شامل تھا۔

بزم ادب اردو کالج کے زیر اہتمام ۱۹۶۰ء میں کل ہند مشاعرے کے سلسلے میں آئے ہوئے شاعروں کے اعزاز میں مشاعرہ ہوا تھا، اس مشاعرہ میں میں نے بھی کلام سنایا تھا۔

نظام کلب کے احاطہ میں "شب تہنیت" کے نام سے مشاعرہ ہوا تھا، اس کی صدارت شاہد صدیقی صاحب نے کی تھی۔ میں اس مشاعرہ کا منتظم تھا۔



"بزم سخن" محبوب نگر کی جانب سے ۲۰ جنوری ۱۹۶۲ء کو کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا تھا، جس میں حسرت جے پوری اور مینا قاضی نے بھی شرکت کی تھی۔ حیدرآباد کے زائد از ۱۵ شاعر اس مشاعرہ میں مدعو تھے۔ اس مشاعرے میں، میں نے بھی شرکت کی تھی۔ ان مشاعروں کے علاوہ میں نے کئی اور کل ہند مشاعرے پڑھے ہیں۔ ادبی ٹرسٹ، شنکر جی میموریل سوسائٹی اور شہر میں منعقد

تمام کل ہند مشاعروں میں میں نے کلام سنایا ہے۔ ملک کے جن اہم شہروں میں میں نے کل ہند مشاعرے پڑھے ہیں، ان کے چند نام یہ ہیں۔ دلی، بمبئی، مدراس، لکھنؤ (فیض آباد)، بھیوانی (ہریانہ)، کھرپالی، بنگلور، جمشید پور وغیرہ۔ ان مقامات کے علاوہ ملک کے کئی اور مقامات پر مشاعرہ پڑھ چکا ہوں۔



میں نے ریاست آندھرا پردیش اور سابق ریاست حیدرآباد کے تقریباً تمام اضلاع کے مشاعروں میں کلام سنایا ہے۔ اضلاع کے مشاعرے زائد از (۳۰) سال سے پڑھ رہا ہوں۔

گذشتہ (۳۰) برسوں سے آل انڈیا ریڈیو سے میرا کلام نشر ہو رہا ہے۔ کئی فیچرز اور تقاریر بھی نشر ہوئی ہیں۔ گذشتہ چھ سال سے دوردرشن کیندر حیدرآباد کے علاوہ نیشنل پروگرام (نیٹ ورک) میں بہ حیثیت شاعر شرکت کرتا رہا ہوں۔ شہر کے حالیہ بھیانک فسادات کے موقع پر دورانِ کرفیو میں نے دوردرشن سے امن کی اپیل کی تھی۔ ریکارڈنگ کے لئے اسٹاف میرے گھر آیا تھا۔

حیدرآباد کے مختلف، اداروں اور انجمنوں کی جانب سے خاص خاص مواقع پر شہر میں جتنے بھی مشاعرے ہوتے تھے ان میں کلام سناتا رہا ہوں۔ ان میں سے بیشتر مشاعروں کے انعقاد کی ذمہ داری بھی کسی نہ کسی طرح مجھے سونپی جاتی تھی۔ جب میں اردو کالج کا طالب علم تھا، اُس زمانے میں شہر کے مختلف کالجس کے مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں تعاون کیا کرتا تھا۔ اُن کالجس کے قابلِ ذکر

یہ نام ہیں۔ نظام کالج، ویمنس کالج (کوٹھی)، طبیہ کالج، ایوننگ کالج، انوارالعلوم کالج، دینک لعل راما ریڈی ویمنس کالج، ونیتا مہاودیالیہ اور آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ۔

حکومت کی سطح سے ان مشاعروں کا نہ صرف میں نے اہتمام کیا ہے بلکہ بیشتر مشاعروں کی نظامت کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ گورنرس، چیف منسٹرز اور وزراء کی جانب سے منعقدہ مشاعروں کی معتمدی کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔

اضلاع کے سرکاری مشاعرے ہوں کہ غیر سرکاری مشاعرے یا ادبی انجمنوں کی جانب سے منعقدہ مشاعرے ہوں۔ حیدرآباد کے زیادہ تر شاعر میری پسند اور میری فہرست کی روشنی میں شرکت کرتے ہیں۔ تقریباً ۴۰ سال سے اضلاع کے مشاعرے پڑھ رہا ہوں۔ اضلاع کے اہم مشاعروں کی ذمہ داری بھی کسی نہ کسی طرح مجھے ہی سونپی جاتی ہے۔ میں ایسے ہی شاعروں کو اپنے ہمراہ لے جاتا ہوں، جن کی شرکت مشاعرہ کی کامیابی کی ضامن سمجھی جاتی ہے جب میں شروع شروع اضلاع کے مشاعرے پڑھتا تھا تو اُس زمانے میں مہمان شاعروں کے لئے بادہ وساغر کا انتظام رہتا تھا لیکن میں نے شراب کے بجائے شعراء کو معاوضہ دلانا شروع کیا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔



میں مشاعروں کی صدارت سے گریز کرتا ہوں، پھر بھی بعض خاص مشاعروں کی میں نے صدارت کی ہے جن میں سے صرف دو مشاعروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

کُل ہند مشاعرہ ناندیڑ (مہاراشٹرا) جو میونسپل کارپوریشن کی جانب سے ۱۹۹۰ء میں منعقد ہوا تھا، جس میں ملک کے ممتاز شعراء نے شرکت کی تھی جن میں قابل ذکر نام یہ ہیں۔ خمار بارہ بنکوی، والی آسی، راحت اندوری، میر ہاشم علی۔ بشر نواز وغیرہ۔

حیدرآباد کرناٹک کی ممتاز شاعرہ صغریٰ عالم کے پہلے مجموعۂ کلام حیطۂ حرف کی رسم اجراء کی تقریب کے سلسلے میں ۱۸ ر نومبر ۱۹۹۰ء کو نیشنل ہائی اسکول میں مشاعرہ ہوا تھا، جس کی صدارت میں نے کی تھی۔ حیدرآباد سے اس مشاعرہ میں راشد آزر، گیان سنگھ شاطر، منان منظور اور ذکی شاداب نے شرکت کی تھی۔



حیدرآباد کے بعض کل ہند مشاعروں کی نظامت کے علاوہ گولڈن جوبلی تقاریب نمائش سوسائٹی کے مشاعرہ کی معتمدی کے فرائض انجام دے چکا ہوں۔
صنعتی نمائش کے موقع پر ہر سال نمائش کلب میں مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ گذشتہ ۱۷، ۱۸ سال سے مشاعرہ کی معتمدی کے فرائض انجام دے رہا ہوں مجھ سے پہلے محترمہ عائشہ رشاد اور جناب شاہد صدیقی نظامت کیا کرتے تھے۔ نمائش سوسائٹی کی زیرنگرانی جناب ہاشم سعید کی مشاورت سے شعراء کی فہرست کو قطعیت دی جاتی ہے۔ نمائش سوسائٹی کے مشاعرے، شہر کے عام مشاعروں کے مقابلے میں اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔
میں نے آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے بیشتر مشاعروں کی نظامت کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی سرکاری مشاعروں کی معتمدی بھی کی ہے۔

(یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے)

جن اساتذۂ سخن نے مجھے متاثر کیا ان میں سے کچھ نام یہ ہیں۔
میر تقی میر، مرزا غالب، یگانہ چنگیزی، علامہ اقبال، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی
ذوقی گورکھپوری، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، شاہد صدیقی
خورشید احمد جامی، مجاز لکھنوی، جاں نثار اختر، اختر شیرانی۔ فارسی
شعراء میں حافظ شیرازی اور امیر خسرو وغیرہ۔

اسکول کے اساتذہ میں جناب نبی الحسن، جناب علیم الدین اور کالج
کے اساتذہ میں پروفیسر ابوالظفر عبدالواحد۔ پروفیسر سید محمد۔ ڈاکٹر حسینی شاہد،
ڈاکٹر زینت ساجدہ، پروفیسر مغنی تبسم اور منظور احمد منظور نے مجھے متاثر کیا ہے۔



میرے ہم عصر شاعروں میں دورِ حاضر کے وہ تمام شاعر شامل ہیں جو مشاعرے
پڑھنے کے علاوہ ادبی رسائل میں چھپتے ہیں اور علمی و ادبی کام انجام دے چکے
ہیں اور انجام دے رہے ہیں۔ حیدرآباد کے شاعروں میں خاص طور پر یہ نام
قابل ذکر ہیں (جن کے ساتھ میں نے مشاعرے پڑھے ہیں)، علامہ حیرت بدایونی
علامہ نجم آفندی، علامہ قدر عریضی، مولانا شیخ احمد شطاری کامل، علامہ
ناصر نذیر یوری، تاج قریشی، شاہد صدیقی، مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد،
سلیمان اریب، منوہر لال شارب، نظر حیدرآبادی، حمایت علی شاعر، سلیمان
خطیب، سرور ڈنڈا، شاذ تمکنت، ڈاکٹر وحید اختر، پروفیسر مغنی تبسم، راشد آذر،
عزیز قیسی، سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، میر احمد خسرو، خواجہ شوق،

انجم عارفی، کلیم قریشی، جہاندار افسر، روحی قادری۔ افسر چغتائی، ریاست علی تاج، ذکی تاداب
اوج یعقوبی، رئیس اختر، ناصر کرنولی، فیض الحسن خیال، اکمل حیدرآبادی، مصطفیٰ علی بیگ
رحمن جامی، ساجد رضوی، منظور احمد منظور، ڈاکٹر صادق نقوی، ڈاکٹر سوہن لال، نجم قمرالدین ہاشمی
کنول پرشاد کنول، علی الدین نوید، عثمان منظور، عزیز بھارتی، گیان سنگھ شاطر
مومن خاں شوق، جوہر ہاشمی، قدیر انصاری، ڈاکٹر منیر الزماں منیر، محسن جلگانوی، حمایت اللہ
طالب خوندمیری، ہندی شاعروں میں راجہ دوبے، اوم پرکاش نرمل، ٹیہپال سنگھ ورما،
دولی چند ششی، گرجا شنکر گریش، نریندر رائے، کالی چرن گیتا راہی۔ وید پرکاش
لاہوٹی ساون اور ڈاکٹر اندو وشسٹ۔ اندیرا دھن وغیرہ۔

خاتون شعراء میں عظمت عبدالقیوم، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، خورشید نذیر،
روحی علی اصغر، ناز حیدر، ڈاکٹر اشرف رفیع، سیدہ مجیدہ، نایاب سلطانہ، فاطمہ تاج،
انجم قمر سوز، عزیز النساء صبا، مظفر النساء ناز، ثریا مہر، ڈاکٹر شمیم پروین، وغیرہ

گذشتہ ۴۰ برسوں میں جتنے اہم شاعر مشاعروں میں کلام سناتے رہے،
میں اُن کے ساتھ مجھے مشاعرہ پڑھنے کا اعزاز حاصل رہا ہے (جن میں قابلِ ذکر کچھ نام
یہ ہیں)۔

جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، آنند نرائن مُلّا، تلوک چند محروم،
سجاد ظہیر، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر سید محی الدین قادری
زور، پروفیسر آل احمد سرور، فیض احمد فیض، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی،
خمار بارہ بنکوی، شمیم جے پوری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی،
مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی، خورشید احمد جامی، حفیظ جالندھری، حمایت علی شاعر،
علامہ نجم آفندی، مولانا شیخن احمد شطاری کامل، حضرت قدر عریضی، مرزا شکور بیگ،

سلیمان اریب، اوج یعقوبی، شاذ تمکنت، شان الحق حقی، معین احسن جذبی،
سکندر علی وجد، جگن ناتھ آزاد، قتیل شفائی، نوشاد علی نوشاد، نور لکھنوی،
ڈاکٹر گوپال داس نیرج، شہریار، زبیر رضوی، تاج قاصلی، علی سردار جعفری وغیرہ۔

مجھے جمہوریہ ہند کے بعض صدر کو بھی شعر سنانے کا اعزاز حاصل ہے۔ جن میں یہ
نام قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ جناب فخرالدین علی احمد، ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی،
جناب گیانی ذیل سنگھ۔

میں نے دلیپ کمار، سنیل دت، نرگس، پران، اجیت، نمی، نسیم بانو،
سائرہ بانو، جیسے اہم فلمی اداکاروں کی موجودگی میں بھی شعر سنائے ہیں



میں نے اپنے ابتدائی کلام پر علامہ قدر عریضی اور اوج یعقوبی سے
اصلاح لی ہے لیکن میں نے اپنے مشقِ سخن اور ابتدائی زمانے کے بیشتر کلام کو
کسی مجموعے میں بھی شامل نہیں کیا ہے۔ حضرت قدر عریضی نے مجھے فی البدیہہ شعر
کہنے کی مشق کروائی۔ حضرت قدر عریضی مجھے اور اپنے ایک اور شاگرد
فیض الحسن خیال کو بھی علم عروض سے واقف کرایا۔ قدر صاحب ہم دونوں
کو مصرعِ طرح دیتے اور نصف گھنٹہ کے بعد ہمارے کاغذات ہم سے لے لیتے۔
تب تک ہم ۶، ۷ شعر کہہ لیتے تھے۔ قدر عریضی صاحب ان اشعار پر اصلاح
دیتے اور ہمیں فنِ شعر کے رموز و نکات سے واقف کرواتے تھے۔ اوج یعقوبی صاحب

بلا وجہ کسی ایک مصرعہ پر بھی اصلاح نہیں دیتے تھے۔ اگر مصرعہ صاف ہے تو اس کو بجنسہٖ رہنے دیتے اور اگر صاف نہ ہو تو کوئی ایک دو لفظ بدل دیتے۔ جب میں نے محسوس کیا کہ مجھ میں خود اعتمادی آگئی ہے تو میں نے ان دونوں اساتذۂ سخن کو اپنا کلام دکھانا ترک کر دیا۔



میرے شاگردوں میں ڈاکٹر منیر الزماں منیرؔ، مظفر النساء نازؔ، ڈاکٹر شمع پروینؔ، اقبال حسین اقبالؔ اور کویتا کرنؔ کے علاوہ اور بھی کچھ نئے اور پرانے شاعر ہیں جو وقتاً فوقتاً مجھ سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے ہیں اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں مجھ سے ثریا مہرؔ اور شاہجہاں عرشیؔ نے بھی اپنے کلام پر اصلاح لی ہے۔



تخلیقِ شعر کے محرکات - ایک مثال

سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن جب اپنے پورے شباب پر تھی تو مجھے نئے نئے باصلاحیت لکھنے والوں اور فنکاروں کی تلاش تھی۔ اس زمانے میں سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کو آل انڈیا ریڈیو سے پروگرامس ملا کرتے تھے اسوسی ایشن کی جانب سے شعری، ادبی و تہذیبی پروگرامس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ایک دن جب میں ریڈیائی پروگرام کی ترتیب و تیاری کے سلسلے میں رشید قریشی صاحب (نائب صدر اسوسی ایشن) اسسٹنٹ سکریٹری بلت کے اجلاس پر پہونچا تو کچھ ہی دیر بعد شعبۂ خواتین کی انچارج مظفر النساء ناز اپنی کچھ ساتھی لڑکیوں کے ساتھ وہاں آئیں۔ ریڈیو سے نشر ہونے والے پروگرام کو قطعیت دینا تھا۔ ان لڑکیوں میں ایک قبول صورت اور جاذب نظر لڑکی بھی تھی جو نئی نئی ملازم ہو کر سکریٹریٹ آئی تھی، جس کو اچھا خاصا ادبی ذوق تھا۔ اس کے خد و خال پُرکشش تھے۔ اس قدر پُرکشش کہ دیکھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بے ساختہ یہ مصرعہ میری زبان سے نکلا۔ ؎

پھر بھی لگتا ہے کہ برسوں سے شناسائی ہے

میں نے غزل اس طرح پوری کی —

پاک نظروں پہ بھی اندیشۂ رسوائی ہے
جب سے دیکھا ہے تمہیں تہمتِ بینائی ہے

اس سے پہلے کبھی میں نے تمہیں دیکھا تو نہیں
پھر بھی لگتا ہے کہ برسوں سے شناسائی ہے

-○-

برگِ آوارہ کی مانند ہے تنہا تنہا
زندگی ساتھ مرا چھوڑ کے پچھتائی ہے

-○-

وقتِ رخصت ذرا پلکوں کو جھکائے رکھنا
آنکھ مل جائے تو ہم دونوں کی رسوائی ہے



آٹوگراف اور شاعر

اردو شاعروں کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ ادب دوست خواتین و حضرات اور خاص طور پر طلباء و طالبات اپنے پسندیدہ شاعروں سے آٹوگراف لیا کرتے ہیں۔ آٹوگراف لینے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو تفریحاً آٹوگراف لیتے ہیں اور بعض لوگ شاعر اور اس کی شاعری سے متاثر ہو کر آٹوگراف لیتے ہیں۔ مجھے بھی بعض شاعروں کی طرح اپنی شاعرانہ زندگی میں آٹوگراف دینے کا

اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ میں نے اکثر مشاعروں میں چاہے وہ شہر کے ہوں کہ اضلاع کے، چاہے بیرون شہر کے ہوں کہ بیرونِ ملک کے ہوں، آٹوگراف دیئے ہیں۔ خاص طور پر حیدرآباد میں (جامعہ عثمانیہ)، نظام کالج، طبیہ کالج، ویمنس کالج، ریڈی ویمنس کالج، ویمنس کالج کوٹھی اور مہاودیالیہ کے مشاعروں میں بہت سے آٹوگراف دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف ایک کالج ونیتا مہاودیالیہ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

نمائش کلب میں شعبۂ اُردو ونیتا مہاودیالیہ کی جانب سے ۷ رفروری ۱۹۶۳ء کو مشاعرہ ہوا تھا۔ اُس وقت ونیتا مہاودیالیہ میں اُردو کے لکچرر اختر حسن صاحب تھے، انھوں نے مجھے اپنے ایک خط کے ذریعہ نہ صرف شرکت کرنے اور کلام سنانے کی خواہش کی تھی بلکہ یہ چاہا تھا کہ میں اپنے بعض شاعر دوستوں کو اس مشاعرہ میں اپنے ہمراہ لے آؤں۔ اختر حسن صاحب نے لکھا تھا ۔ ۔ ۔

" میں لڑکیوں کے جس کالج میں پڑھاتا ہوں (ونیتا مہاودیالیہ نمائش گراؤنڈ) اس کالج کے زیر اہتمام پرسوں یعنی ۷ رفروری ۱۹۶۳ء کو نمائش تھیٹر میں شام کے ۷ بجے سے ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کی جارہی ہے۔ یہ کام میرے ذمہ کیا گیا ہے کہ میں حیدرآباد کے قابل ذکر شاعروں سے مل کر اُن کو اس محفل میں شرکت کی دعوت دوں۔ اور آپ میں اپنی یہ ذمہ داری آپ کو سونپ رہا ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ آپ نہ صرف خود تعاون فرمائیں گے بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی دعوت شرکت مشاعرہ پہونچادیں گے بلکہ ان کو اپنے ساتھ لائیں گے۔ میں نمائش تھیٹر یا نمائش کلب میں آپ احباب کا سواگت کرنے کیلئے موجود رہوں گا

میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے طور پر چند منتخب شاعروں کو میری جانب سے مدعو کر دیجئے۔ نوجوان شاعروں کو خاص طور پر دعوت دینا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے خود ملنے کی بھی کوشش کروں گا، آج رات کو یا کل۔ مدینہ ہوٹل میں مغرب کے بعد۔"

(۵ر فروری ۱۹۶۳ء)

جب مشاعرہ ختم ہوا تو لڑکیاں آٹو گراف کے لئے ہم شاعروں پر ٹوٹ پڑیں۔ خاص طور پر میں اور رئیس اختر کافی دیر تک آٹو گراف دیتے رہے، یہاں تک کہ ہمارے ساتھی ریفریشمنٹ کے بعد واپس ہو رہے تھے۔ مشاعرہ کے بعد جب میں لوٹ رہا تھا تو نمائش کلب کے آفس اور مین گیٹ کے درمیان ایک درخت کے نیچے یہی ۵، ۶ لڑکیاں کھڑی ہوئی تھیں، اُن میں سے ایک دراز قد، خوبرو، صحت مند لڑکی نے مجھے روک لیا اور میرے سامنے اپنی بیاض کھولی اور کہا کہ آٹو گراف دیجئے اور وہی شعر لکھیئے جو میں لکھوانا چاہوں، میں نے کہا ٹھیک ہے۔ وہ غالباً بی۔ اے سالِ آخر کی طالبہ تھی، اخبارات، ریڈیو، رسائل اور مشاعروں کی وساطت سے مجھ سے واقف تھی۔ وہ لڑکی میری غزل کے کچھ شعر اس طرح لکھواتی رہی۔

کہتے کہتے رُکتے کیوں ہو، دل میں جو ہے کہہ دو۔ بھی
ہم بھی کوئی غیر نہیں ہیں، آخر اتنا سوچ رہی

جاتا تو ہے سب کو لیکن آخر اتنی جلدی کیوں
کب سے میں بیٹھا ہوں سرہانے آنکھیں اپنی کھولو بھی

سب کو چھوڑ کے آیا ہوں میں تم کو کیا معلوم نہیں
جاؤ۔ کہاں محفل سے تمہاری آنکھیں اپنی کھولو بھی

کس نگری کا باسی ہوں میں کس کی خاطر آیا ہوں
اک دن اپنے پاس بلا کر مجھ سے اتنا پوچھو بھی

ان عطر آمیز خوشگوار لمحوں کے بعد یہ لڑکی مجھے پھر نہیں دکھائی دی۔ لیکن مشاعروں میں جب بھی لڑکیاں آٹوگراف لیتی ہیں تو مجھے وہ شائستہ مزاج، خوبصورت خدوخال والی لڑکی بے ساختہ یاد آتی ہے۔



ویمنس کالج گلبرگہ کا مشاعرہ

آج سے ۱۸، ۱۹ سال پہلے کی بات ہے کہ حیدرآباد کے کچھ شعراء گلبرگہ کے ایک بڑے مشاعرہ میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ مشاعرہ کے دوسرے دن صبح ۱۱ بجے جناب وہاب عندلیب کی قیادت میں ایک مشاعرہ، مہمان شعراء کی آمد کے سلسلے میں شریمتی وی۔جی ویمنس کالج میں منعقد ہوا۔ مشاعرہ گاہ میں خواتین و طالبات کی کثیر تعداد موجود تھی۔ جیسے ہی میں شاعر دوستوں کے ساتھ شہ نشین پر پہونچا اور میں نے

اپنی نشست سنبھالی، بالکل میرے پہلو میں ایک جاذب نظر، نہایت متین و سنجیدہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے سلام کیا، اُس کے ہاتھ میں میرا تازہ مجموعۂ کلام "زخموں کے گلاب" تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ حیدرآباد کی لڑکی ہے۔ اور حال ہی میں گلبرگہ میں بیاہی گئی ہے۔ اُسے شعروشاعری سے بے حد لگاؤ ہے میری شاعری اُس کو بہت پسند ہے۔ اُس نے مجھے یہ بھی کہا کہ وہ میرا کلام اخبار سیاست میں پڑھتی رہتی ہے، ریڈیو اور مشاعروں کے وسیلے سے بھی مجھ سے اُس کا رشتہ ہے۔

اس واقعہ کو گذرے ہوئے کئی برس ہوئے، لیکن جب کبھی میں اپنے ماضی کے اوراق اُلٹتا رہتا ہوں تو اُس لڑکی کی پرچھائیاں بھی ان اوراق پر نظر آتی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں میں آج تک بھی اُس لڑکی کے پاکیزہ صاف و شفاف چہرہ اور اس کے اندازِ گفتگو کو بھلا نہ سکا۔



مشاعروں میں بھیگی پلکیں

۱۵، ۱۶ سال قبل انجمن قادریہ کی جانب سے پُلو نعامنہ لاڈ بازار میں عظیم الشان پیمانے پر جلسۂ رحمت اللعالمینؐ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جلسے کی نگرانی سید مکرم شاہ صدر نشین مجلس قانون ساز کونسل آندھرا پردیش نے کی تھی۔ مقررین میں ریاست کرناٹک کے

ایک وزیر عزیز سیٹھ بھی شامل تھے ۔ میں بھی اُس جلسے میں ایک شاعر کی حیثیت سے مدعو تھا ۔ میں نے ترنم میں ایک نعت شریف سنائی تھی، ایک شعر تقریباً ۵، ۶ بار پڑھوایا گیا ۔ ساری محفل میں ایک نورانی فضا ء چھاگئی ۔ یوں محسوس ہورہا تھا کہ سامعین ایک خاص کیفیت میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔ شعر سناتے سناتے میں خود بھی گلوگیر ہوگیا تھا ۔ وہ شعر یہ ہے ۔

آنکھوں میں لئے حسرتِ دیدارِ مدینہ
میں کب سے مدینہ کی طرف دیکھ رہا ہوں

نعت شریف کے کچھ اور شعر یہ ہیں

للّٰلہ کرم کیجئے بہت ٹوٹ چکا ہوں
پھر آج میں حالات کی چوکھٹ پہ کھڑا ہوں
نظروں کو جھکائے ہوئے آداب سے ملئے
میں آلِ پیمبر کے گھرانے کا گدا ہوں
ہیں نقشِ قدم کس کے یہ پہچان لو مجھ کو
کچھ دن کے لئے میں بھی فقیروں میں رہا ہوں
آنکھوں میں ندامت ہے نظر اُٹھ نہیں سکتی
میں سر کو جھکائے ہوئے خاموش کھڑا ہوں

شاید اس نعت شریف کا ہی فیضان ہے کہ پروردگار نے مجھے روضۂ اقدس پر حاضری دینے کا موقع عنایت فرمایا



● ممتاز دانشور، محقق و نقاد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا بعارضۂ قلب کشمیر میں اچانک انتقال ہوا تو سارے ادبی حلقوں میں ایک ماتم کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ سینکڑوں لوگ ایوانِ اردو میں جمع ہونے لگے۔ اُن سوگواروں میں ایک میں بھی تھا۔ موسم کی خرابی اور کشمیر میں مسلسل برف باری کی وجہ سے ڈاکٹر زور کی نعش کو حیدرآباد لانا ممکن نہ ہو سکا تھا۔ ڈاکٹر زور کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد ایوانِ اردو میں بڑے پیمانے پر جلسۂ تعزیت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تعزیتی نظم سنانے والے شاعروں میں، میں بھی شامل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے اپنی نظم ترنم میں سنانی شروع کی تو محفل پر ایک اثر انگیز سوگوارانہ کیفیت چھا گئی۔ میں نے دیکھا کہ شعبۂ خواتین میں کچھ خواتین رو رہی ہیں (رونے والوں میں ڈاکٹر زور کی بیگم اور ان کی لڑکیاں بھی تھیں) اس ماحول نے مجھے بھی رقت آمیز کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ جب میں نے نظم کے یہ دو مصرعے سنائے تو محفل کی کیفیت ہی بدل گئی۔

کیا جہاں بھی نیند آجائے وہیں سوتے ہیں لوگ
زورؔ! تیرے آخری دیدار کو روتے ہیں لوگ

ڈاکٹر زور کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ محفل کا ہر شخص مغموم دکھائی دے رہا تھا۔



● محلہ علی آباد (انجن باؤلی) میں میرے ایک دوست نواب حبیب اللہ خاں کے نسبتی برادر غلام محی الدین کا اسکول تھا جس میں تمام اساتذہ خواتین تھیں۔ اسکول میں طالبات کی کثیر تعداد تھی۔ شہر کے دوسرے اسکولوں کی طرح اس اسکول میں

بھی افتتاحیہ اور اختتامیہ جلسے ہوا کرتے تھے۔ ایک افتتاحیہ جلسے میں مشہور شاعر فیض الحسن خیالؔ کو مدعو کیا گیا تھا۔ خیالؔ صاحب نے مجھ سے کہا کہ اس اسکول میں ایک خودپسند ٹیچر ہے جس نے میرے اشعار پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ میں چاہتا ہوں کہ اب کی بار اس ٹیچر کو متاثر کیا جائے۔ میں نے کہا کہ دیکھا جائے گا۔ اسکول کی سالانہ تقریب میں خیالؔ اور میں مدعو تھے۔ اس محفل میں، میں نے ایک غزل ترنم میں سنائی۔ میں نے دیکھا کہ اس خودشناس لڑکی کی پلکیں بھیگ چکی ہیں۔ اس غزل کے کچھ شعر یہ ہیں۔ ؎

چاہتا ہوں کہ جی بھر کے باتیں کر دوں، عمر بھر آپ کا ساتھ ہو یا نہ ہو
کون جانے کہ کل پھر مرے ہاتھ میں آپکا پھول سا ہاتھ ہو یا نہ ہو

لَے الگ ہے مگر ایک ہی ساز ہے، تیری آواز میں میری آواز ہے
پھر بھی ڈرتا ہوں اے محورِ آرزو آخری سانس تک ساتھ ہو یا نہ ہو

ایک خاموش شرحِ اظہارِ غم کے سوا کوئی عنواں نہیں آج کی رات کا
آخری بار کرتا ہے عہدِ وفا پھر دوبارہ ملاقات ہو یا نہ ہو

تیرِ غم زدہ سے بنامِ غزل، ایک مجروح نغمہ سمجھ کر سہی
چوٹ کھایا ہوا گیت سن لیجئے، پھر یہ نغمات کی رات ہو یا نہ ہو





بسلسلۂ عرس شریف تقاریب مولانا کامل شطاری ' زیرِ اہتمام کامل اکیڈیمی ' ۲۰ جون ۱۹۹۰ء کی شب آستانۂ شطاریہ (نورخاں بازار) میں ایک نمائندہ نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس کی نگرانی مشہور الخبیر الحاج محمدؐ ولی قادری نے کی تھی۔ معتمدی کے فرائض میں نے انجام دیئے تھے۔ عقیدت و احترام کے ماحول میں تمام شاعروں نے اپنا بہترین کلام سنایا تھا۔ جب میں نے اس مطلع ؎

وہ سرزمینِ پاک ابھی تک نظر میں ہے
کیسا کرشمہ نسبتِ خیر البشر میں ہے

کے بعد یہ شعر سنایا۔ ؎

شرمندگی ہے سر کو جھکائے کھڑا ہوں میں
عصیاں کا سب حساب مری چشمِ تر میں ہے

تو ساری محفل پر ایک وجد آور کیفیت چھا گئی اور اس شعر کو زائد از آٹھ مرتبہ پڑھوایا گیا ' جب میں مقطع کے اس شعر

نیّرؔ میں صبح و شام کی الجھن میں کیوں رہوں
جب نظمِ دوجہاں مرے آقا کے گھر میں ہے

پر پہونچا تو میری بھی پلکیں بھیگ گئیں اور مجھے رقت آمیز کیفیت میں شعر سناتے سناتے کچھ دیر کیلئے رکنا پڑا ' اور میں اپنے آپ پر قابو پانے کے بعد مقطعہ مکمل کر سکا۔ میں نے دیکھا کہ بیشتر سامعین ایک خاص کیفیتِ نورِ محمدیؐ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی پروردگار اپنے گنہگار بندوں کو اس قدر نوازتا ہے کہ سوچنا پڑتا ہے کہ اُسکو گنہگار کی کون سی ادا بھا گئی ہوگی۔ اللہ کی کرم نوازیوں سے اتنا اطمینان تو ہوجاتا ہے کہ نعتِ رسولؐ کے صدقے میں کچھ تو گناہ معاف ہوجائینگے۔

شاعر کو غائبانہ چاہنے والی ایک معصوم لڑکی

ایک معصوم سی، بھولی بھالی، سیدھی سادی لڑکی گذشتہ ۲، ۳ سال سے ہمیشہ تو نہیں، کبھی کبھی مجھ سے فون پر گفتگو کیا کرتی ہے۔ جب وہ بات کرتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے لب و لہجہ میں ایک ایسی بیٹی کی خوشبو شامل ہے جس کی تربیت و پرورش، ایک علمی و ادبی گھرانے میں ہوئی ہے۔ وہ لڑکی میری شاعری کی بے حد مداح ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اُس کے ہاں میرے تمام شعری مجموعے ہیں۔ وہ لڑکی فون پر بہت دیر تک گفتگو کرتی ہے۔ گفتگو کا موضوع شعر و ادب ہوتا ہے۔ اُس لڑکی کو میں نے کبھی نہیں دیکھا لیکن اُس کی آواز اور اُس کے اندازِ گفتگو سے میں نے اس کی ایک خیالی تصویر بنالی ہے۔ یقیناً وہ میری بیٹی زینت اسریٰ کی طرح سیدھی سادی، پیاری پیاری سی ہوگی۔ وہ لڑکی شاعرہ نہیں ہے، اُسے صرف اچھے اچھے شعر سُننے، پڑھنے اور یاد رکھنے کا شوق ہے۔ جب کبھی وہ مشاعروں میں یا ریڈیو اور ٹی وی سے میرا کلام سنتی ہے تو مجھے فون ضرور کرتی ہے۔ پھر کچھ مہینوں کے لئے غائب ہوجاتی ہے۔



حیدرآباد میں گنگا جمنی مشاعرے

حیدرآباد میں ہندی، اُردو کے ملے جُلے مشاعرے اور ملی جُلی ادبی محفلوں کی روایت کا سہرا حیدرآبادی تہذیب کی نمائندہ شخصیت جناب ایل۔این۔ گپتا مرحوم (سابق سکریٹری پلاننگ ڈپارٹمنٹ حکومت آندھراپردیش کے سر جاتا ہے۔ مرحوم کے بعد اس روایت میں کمی ہونے لگی تھی، لیکن اس روایت کو زندہ رکھنے اور اس میں ایک نئی روح پھونکنے کے لئے، اُردو ہندی کے ممتاز شاعر جناب نیرپال سنگھ ورما نے دلچسپی لینی شروع کی اور میں نے اُردو شاعروں کی جانب سے اُن سے مکمل تعاون کیا۔ ہم دونوں نے اس روایت کو آگے بڑھانے کے لئے عملی اقدام شروع کیا، چنانچہ گذشتہ ۱۰، ۱۲ برس سے ہم اس بات کے لئے کوشاں ہیں کہ ہمارے دائرۂ اختیار میں جہاں کہیں بھی مشاعرے اور کوی سمیلن منعقد ہوں یا ہم دونوں کی نگرانی یا مشاورت سے محفلیں سجا کرتی ہوں تو ہم لازماً ایسی راہ نکالیں کہ مشاعرے اور کوی سمیلن میں ہندی، اُردو کے شاعر شریک رہیں۔ چنانچہ ہم حوصلہ افزاء ماحول میں انتہائی کامیابی کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہے ہیں۔ ان ملے جلے مشاعروں اور کوی سمیلن کی افادیت سے کون انکار کرسکتا ہے اس سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں لسانی ہم آہنگی موجود ہے۔ اُردو اور ہندی کے دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں میں یکجہتی ہے اور دونوں ایک دوسری کی زبان کا احترام کرتے ہیں اور ان کے تحفظ اور چلن کے لئے اقدام کرتے ہیں۔

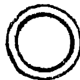
فرما صاحب گیت چاندنی اور ہندی لیکھک سنگھ کی ادبی تقاریب اور کوی سمیلن میں لازمی طور پر اُردو شاعروں اور ادیبوں کو مدعو کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح میں بھی یکسانیت کا عملی ثبوت دینے کے لئے میرے زیر انتظام جتنے بھی مشاعرے ہوتے ہیں، اُن میں ہندی کے کچھ نمائندہ شاعروں کو ضرور مدعو کرتا ہوں۔ یہ عمل آج بھی جاری ہے۔

۱۹۹۱ء

ہمارے شہر میں ماہ فبروری میں جب اچانک منصوبہ بند طریقے سے بھیانک فساد برپا ہوا تو اردو، ہندی کے شاعروں نے کئی ایک عمدہ نظمیں کہیں، مشاعروں آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن کے مشاعروں میں نظمیں سُنا سُنا کر قومی یک جہتی کے فروغ کے لئے ایک اچھا تاثر چھوڑا۔

اُردو ہندی کے ملے جلے مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست جناب محبوب حسین جگر ہمیشہ مجھ سے یہ کہتے رہتے ہیں کہ اُردو مشاعروں میں ہندی کے شاعروں کو ضرور مدعو کیا کرو۔ کیونکہ ہمارے شہر کی ایک خاص لسانی تہذیب ہے۔ یہاں کی تہذیبی روایات ملک کی تمام ریاستوں میں بالکل علاحدہ نوعیت کی ہیں۔ جناب محبوب حسین جگر نے خود بھی عملی ثبوت دیتے ہوئے روزنامہ سیاست میں ہندی شاعروں کی بہت سی نظمیں شائع کیں (یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے)۔ سیاست کی طرح ہندی ملاپ نے بھی فسادات کے موضوع پر اُردو شاعروں کی ہندی اور اُردو کی نظمیں شائع کیں۔ ہمارے شہر کے بعض مشاعروں میں تلگو کے شاعروں کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ جس کی مثال خاص طور پر مشاعرۂ دکن اور سالار جنگ میوزیم کے سالانہ مشاعروں سے دی جا سکتی ہے۔ اُردو کے شاعروں

میں شرکت کرنے والے ہندی شاعر نہپال سنگھ ورما کے علاوہ اوم پرکاش نرمل، کنول پرشاد کنول، نریندر رائے، ویرپرکاش لاہوتی ساوتی، وینو گوپال بھٹ، گرجا شنکر گریش، کالی چرن گیتا راہی، ٹی۔ ایس۔ سنگھ لاٹ، دولی چند ششی، سوا حسین، ڈاکٹر اندو وشسٹ، ڈاکٹر ایلیا مشرا، پشپا پدما اور مینا گپتا اور ہندی کوی سمیلن میں شریک ہونے والے اردو شاعروں میں سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، امیر احمد خسرو، ڈاکٹر موہن لال نگم، صلاح الدین نیر، ڈاکٹر اشفاق آزر، رحمن جامی، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، ڈاکٹر صادق نقوی، منوہر لال بہار، عزیز بھارتی، ڈاکٹر منیر الزماں منیر، مومن خاں شوق، متین منظور، صادق نوید، علی الدین نوید، منظور احمد منظور، گیان سنگھ شاطر، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، نمایاں خصوصیات سلطانہ مشاطہ (؟)، عزیزہ المناصبا، ڈاکٹر شمع پروین اور کویتا کرن شامل ہیں۔



عظمت عبدالقیوم

حیدرآبادی تہذیب کی نمائندہ خاتون عظمت عبدالقیوم، میری منہ بولی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں۔ وہ مسلم معاشرہ کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھیں۔ ہر شخص کی زندگی میں بعض ایسی شخصیتیں بھی آتی ہیں جو نہایت خاموشی سے اپنے گہرے تاثرات چھوڑ جاتی ہیں۔ عظمت آپا کی شخصیت ایک عجیب نورانی کیفیات کی حامل تھی ہمارے معاشرے کی کیسی ہی قدآور شخصیت کیوں نہ ہو، وہ اس پرکشش شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اُن کی عزت و احترام کرنا جیسے ایک لازمی فریضہ تھا۔ ایسا احساس ہر اس شخص کا ہوتا تھا جو اُن سے ملنے کے لیے آتا تھا۔ اُن کے چہرہ پر اس قدر نور تھا کہ گمان ہوتا کہ یہ ایک نورانی مخلوق ہیں۔ شخصیت کی جاذبیت اور پُرجمال چہرہ اُن کی طرف متوجہ کرتا تھا۔ نرم گفتاری، شائستہ روی، شگفتہ مزاجی، طبیعت کی سنجیدگی یہ تمام خصوصیات ایک شخصیت میں ضم ہوگئی تھیں۔ عظمت آپا نے مجھے اپنے چھوٹے بھائی جیسا پیار دیا تھا، انہوں نے ہمیشہ مجھے محبت اور شفقت کی نظر سے دیکھا۔ وہ میری ہر بات سنجیدگی اور توجہ سے سُنا کرتیں اور عمدگی اور نرمی سے جواب دیتیں۔ میں نے عظمت آپا کو کسی

کی بھی غیبت کرتے ہوئے کبھی نہیں سُنا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی زندگی کا سارا فلسفہ دوسروں کو خوش دیکھنا ہے۔ ایسے پاک صاف، پُرنور پُراثر، باوقار اور قابلِ احترام چہرے میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ سچ پوچھئے تو عظمت آپا حیدرآبادی تہذیب کی ایک روشن علامت تھیں جن پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔

عظمت آپا کو میں نے ۲۸ سال پہلے ایوانِ اُردو کے ایک مشاعرہ میں دیکھا اور سُنا تھا۔ وہ گوشۂ خواتین میں بیٹھی ہوئی تھیں (ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ حیات تھے)، مشاعرہ کا انتظام فرش پر تھا۔ ایوانِ اُردو شائقینِ مشاعرہ سے بھرا ہوا تھا۔ بعض ایسے شاعر جن سے اُن کے اچھے مراسم تھے اُن کے پاندان کے اطراف جمع ہوجاتے تھے، وہ اُن شاعروں کو بڑے خلوص سے پان بنا بنا کر پیش کرتی تھیں۔ اُن کے پاندان کے خانوں میں وہ تمام لوازمات ہمیشہ موجود رہتے تھے جو اچھے اور لذیذ پان کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ عظمت آپا کے کلام اور اُن کی باوقار شخصیت نے مجھے کافی متاثر کیا تھا۔ ایوانِ اُردو اور اُردو ہال کے مشاعروں میں اور کہیں کوئی خاص مشاعرہ ہو تو عظمت آپا اپنا کلام سناتی تھیں۔ مشاعروں میں رکھ رکھاؤ کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ عظمت آپا سے ایسے خاص خاص مشاعروں میں صاحب سلامت رہتی تھی۔ اُس زمانے میں بعض ادب دوست گھرانوں میں شعر و سخن کی محفلیں سجا کرتی تھیں۔ ایسی محفلوں میں مجھے بھی مدعو کیا جاتا تھا۔

محفلِ خواتین کے قیام کے بعد مجھے عظمت آپا سے ملنے کا زیادہ موقع ملنے لگا۔ محفلِ خواتین کے ہر چھوٹے بڑے کام سے متعلق مجھ سے وہ لازماً مشورہ کیا کرتی تھیں۔ انہیں مجھ پر بھرپور اعتماد تھا کہ میں انہیں صحیح مشورہ دوں گا اور اُن سے مکمل تعاون کروں گا۔ عظمت آپا کے شوہر محترم عبدالقیوم صاحب چیف انجینئر مجھے بے حد چاہتے تھے۔ اُن کا مسکراتا ہوا پُر وقار چہرہ مجھے ہمیشہ متاثر کرتا رہا۔ اگر میں کسی خاص مشاعرہ میں شرکت کے لئے عظمت آپا سے خواہش کرتا تو قیوم صاحب یہ کہہ کر عظمت آپا کو مشاعرہ میں شرکت کی اجازت دیتے کہ نیئر صاحب نے مدعو کیا ہے' تو یقیناً وہ محفل تمہارے لائق ہوگی' معیاری اور شائستہ بھی۔ تمہیں اس محفل میں شرکت کرنی چاہیئے۔ (میری یہ فطرت ہے کہ مجھ پر جب کوئی بھروسہ کرتا ہے تو میں بہر قیمت اُس بھروسہ کی لاج رکھتا ہوں) اُن دونوں کے بزرگانہ اور مشفقانہ سلوک سے میں اُن کی جانب کھینچتا چلا گیا۔ مشاعرے ہوں کہ محفلِ خواتین کے اجلاس' اُن کی چہیتی بیٹی شاداں ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتی تھی۔ شاداں کو میرا ترنم بہت پسند ہے' وہ کہتی ہیں نیئر بھائی جب آپ ترنم میں غزل سناتے ہیں تو مجھے رونا آتا ہے۔ بہت درد انگیز ترنم ہے آپ کا۔ عظمت آپا اپنی بیٹی شاداں کو ستانے کے لئے کہتی تھیں کہ ہماری بیٹی کو تو ہمارا کلام پسند ہی نہیں ہے' اُسے تو بس نیئر بھائی کا کلام پسند ہے۔ (شاداں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو چھوٹی بہنوں میں ہوتی ہیں)۔

محفلِ خواتین کی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں عظمت آپا کا نام سرفہرست آتا ہے۔ اس تنظیم کی وقعت، بہتر کارکردگی، انفرادیت اور وقار کو برقرار رکھنے کے لئے وہ بہت محنت کرتی تھیں۔ محفلِ خواتین کے استحکام کے لئے انہوں نے دامے، درمے، قلمے، سخنے، قدمے ہر طرح کا تعاون کیا۔ عظمت آپا نے اپنی راست نگرانی میں محفلِ خواتین کی "غزلوں کی رات" کا تین مرتبہ اہتمام کیا تھا۔ وہ چار ادبی میگزین کی مدیر رہیں۔ اُن کے علمی تعاون سے محفلِ خواتین کا مالیہ مستحکم ہوا۔ انجمن کی سرگرمیوں اور سالانہ تقاریب کے انعقاد کے سلسلہ میں، میں نے اُنہیں کبھی نا اُمیدی اور مایوسی کا شکار ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ بڑے عزم و استقلال کے ساتھ پُراعتماد فضا میں کام کرتی تھیں۔ اور اپنے ساتھیوں سے بھی اُسی انداز سے کام لیتی تھیں۔ اُن کے کام کرنے کا انداز سب سے جداگانہ تھا۔ دوستانہ ماحول میں کام کرنے کی انھیں عادت تھی۔ اُن کے ہر عمل سے اُن کا شخصی اور خاندانی وقار جھلکتا تھا۔ ہر کام میں معیار، سلیقہ، نفاست کا خیال رکھتی تھیں۔ روابط کے اس طویل عرصہ میں عظمت آپا کی نرم گفتاری میں کبھی فرق نہیں آیا۔ نہایت معاملہ فہم، متوازن مزاج، سنجیدہ طبیعت کی مالک تھیں۔ شائستگی، انسان دوستی اور شخصیتوں کا احترام و لحاظ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ عظمت آپا جہاں ایک اعلیٰ مرتبت شاعرہ تھیں وہیں ایک صاحبِ طرز ادیب بھی تھیں۔ اُن کی سب سے بڑی دولت ان کی بیٹی شاداں ہے۔ عظمت آپا سے میری آخری ملاقات اُن کے

انتقال سے کچھ دن پہلے اُن کے مکان " خیابان " پر ہوئی۔ ۲۱ مئی ۱۹۶۸ء کی ابتدائی ساعتوں میں بہ عارضہ قلب ان کا انتقال ہو گیا۔ عظمت آپا کے انتقال کے بعد شہر کی بہت سی علمی، ادبی انجمنوں اور تہذیبی اداروں نے تعزیتی جلسے منعقد کئے۔ اور بعض ممتاز شخصیتوں، شاعروں اور ادیبوں نے بھی انفرادی طور پر اپنی تحریروں کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کیا۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱½ ماہ تک جاری رہا۔ عظمت آپا کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ مسلم اقلیت کی اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنی بیٹی شاداں کے نام سے شاداں ایجوکیشنل سوسائٹی قائم کی جائے، جس کے زیر انتظام مسلم اقلیت کے لئے کالجس قائم کئے جائیں، چنانچہ ان کی زندگی میں شاداں کالج آف ایجوکیشن قائم کیا گیا، پھر جونیئر کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے بعد شاداں ڈگری کالج قائم کیا گیا۔ اب اس کالج میں کمپیوٹر سائنس کی تعلیم اور ایل ایل بی کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ اس سوسائٹی کے لئے عظمت آپا نے اپنی زندگی بھر کا سرمایہ دیا ہے۔ ان کالجس کی وجہ سے بھی عظمت آپا کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ میری بہن شفیعہ قادری لیکچرار شاداں کالج نے عظمت آپا کی رہائش گاہ " خیابان " کی مناسبت سے 'بزمِ خیاباں' قائم کیا تھا۔ اس بزم خیاباں کا شاندار افتتاح عظمت آپا کی زندگی میں ہوا جس کے لئے شفیعہ نے کافی محنت کی تھی۔ عظمت آپا کا سلوک ہمیشہ مجھ سے، ایک چھوٹے بھائی جیسا رہا، انہیں مجھ سے بے حد خلوص تھا۔ مہینہ میں ۳، ۴، بار اُن سے میری ملاقات ضروری تھی۔ اگر کسی وجہ سے ملاقاتیں نہ ہوتیں تو وہ

فون کرکے بہ اصرار مجھے اپنے گھر بلواتیں ۔ ویسے بھی جشن عظمت عبدالقیوم کے بعد میرا اُن کے پاس آنا جانا کچھ زیادہ ہی ہوگیا تھا۔

گورنر آندھرا پردیش شریمتی کمود بین جوشی، عظمت آپا کا بڑا احترام کرتی تھیں ۔ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ عظمت آپا، تشادال اور میں گورنر صاحبہ سے ملنے کے لئے راج بھون گئے ہوئے تھے۔ جیسے ہی گورنر صاحبہ کو یہ معلوم ہوا کہ عظمت آپا آئی ہوئی ہیں تو وہ عظمت آپا کو لینے کے لئے اپنے چیمبر سے باہر آئیں اور اپنے بازو کرسی پر عزت و احترام سے بٹھائیں اور جب عظمت آپا واپس ہو رہی تھیں تو وہ عظمت آپا کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھے ہوئے موٹر کے قریب تک تشریف لائیں اور انہیں موٹر میں بٹھا کر واپس ہوتے ہوئے کہا کہ آپ کے لئے راج بھون کے دروازے ہمیشہ کھُلے رہیں گے، جس وقت چاہیں بلا روک ٹوک آسکتی ہیں۔

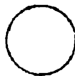
عظمت آپا کے انتقال سے دو مہینے پہلے ۲۱ مارچ ۱۹۸۸ء کو اُن کے ۴۰ سالہ شعری و ادبی خدمات کے اعتراف میں، میں نے جوبلی ہال میں عظیم الشان پیمانے پر تہنیتی تقریب منعقد کی تھی۔ اس جشن کے موقع پر 'عظمتِ غزل' کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی گئی تھی جس کو میں نے مرتب کیا تھا' جس کی رسم اجراء گورنر آندھرا پردیش شریمتی کمود بین جوشی نے انجام دی تھی۔ جلسے کو ڈاکٹر عابد علی خاں، مدیر سیاست، جسٹس سردار علی خاں، نواب شاہ عالم خاں اور پروفیسر مغنی تبسم نے بھی مخاطب کیا تھا۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے صدارت کی تھی۔ اس جلسے میں اظہار تشکر کرتے

ہوئے عظمت آپا نے میرے بارے میں کہا تھا کہ میں اپنے بھائی صلاح الدین نیّر کی محنتوں کا صلہ تو کچھ نہیں دے سکتی، البتہ میری دعا ہے کہ نیّر کو میری عمر لگ جائے۔

عظمت آپا نے انتقال سے کچھ دن پہلے مجھ سے کہا تھا کہ میں زندہ رہوں یا نہ رہوں، میرے مضامین کا مجموعہ شائع ہونا چاہیئے۔ حسبِ خواہش 'عظمت خیابان' کے نام سے میں نے کتاب شائع کی ہے۔ عظمت آپا کے چار شعری مجموعے زرگل، رگِ گل، سفر و سحر، اور عظمتِ وطن شائع ہو چکے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے عظمت عبدالقیوم۔حیات اور کارنامے' کے عنوان سے ڈاکٹر اکبر علی بیگ کی زیر نگرانی عبدالوہاب غوری نامی ایک طالب علم ایم فل کے لئے مقالہ لکھ رہا ہے۔ عظمت آپا کو اس بات کا دُکھ تھا کہ اُن کے خاندان میں شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے نہیں کے برابر ہیں۔ بعض دفعہ مجھ سے ہنستے ہوئے کہتی تھیں کہ میرے ادبی وارث تو آپ ہی ہیں۔

قیوم صاحب کے انتقال کے بعد عظمت آپا بُری طرح ٹوٹ چکی تھیں تقریباً ۱½ سال تک وہ بالکل خاموش رہیں۔ میرے مسلسل اصرار اور شریمتی روڈا مستری کی خواہش پر وہ محفلِ خواتین کی سرگرمیوں میں دوبارہ شامل ہوگئیں۔ اپنی نجی گفتگو میں مجھے شریک کیا کرتی تھیں۔ بہت سے گھریلو معاملات میں مجھ سے مشورہ لیا کرتیں۔ عظمت آپا کے گھر کی تقریباً ہر تقریب میں میری شرکت لازمی سمجھی جاتی۔ جب ان کا انتقال ہوا تو میں نے تمام اخبارات میں ان کے سانحۂ ارتحال

کی خبریں شائع کروائیں۔ تمام اُردو اخبارات میں شہ سُرخیوں کے ساتھ انتقال کی خبر شائع ہوئی۔ محترم محبوب حسین جگر صاحب کی شخصی دلچسپی سے ٹی۔وی اور ریڈیو سے بھی انتقال کی خبر نشر ہوئی۔ گورنر تبر کی خواہش پر راج بھون سے تمام اخبارات اور نیوز ایجنسیوں کے نام انتقال کی خبر بھجوائی گئی۔ خطۂ صالحین دارالسلام روڈ، آغاپورہ، میں عظمت آپا کی آخری آرام گاہ ہے۔ کبھی کبھی خطۂ صالحین جاتا ہوں اور اُن کی قبر کے قریب خاموش کھڑا ہوجاتا ہوں تو بھیگی پلکوں کے ساتھ ذہن میں ماضی کا ایک ایک ورق اُلٹنے لگتا ہے۔ ..



صالحہ الطاف

جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں لکھا ہے کہ بانو طاہرہ سعید نے اپنی قیام گاہ پر ایک پُرتکلف عصرانہ میں کچھ مخصوص شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ساتھ بعض ایسی ممتاز شخصیتوں کو بھی مدعو کیا تھا، جن سے ان کے شخصی مراسم تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اُس محفل میں سید ہاشم علی اختر (وائس چانسلر عثمانیہ و علی گڑھ یونیورسٹی) بھی اپنی فیملی کے ساتھ شریک تھے (جو اُس زمانے میں ڈپٹی سکریٹری جنرل ایڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ تھے) جناب منظور احمد منظور بھی وہاں موجود تھے۔

صالحہ الطاف سے میری پہلی ملاقات یہیں ہوئی۔ اُس زمانے میں بانو طاہرہ سعید، عظمت عبدالقیوم اور روحی علی اصغر (جو پاکستان چلی گئیں) کے یہاں بھی مخصوص شعری محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ اُن محفلوں میں میری شرکت لازمی سمجھی جاتی تھی۔ مجھے اس طرح کے تمام گھرانے پسند تھے۔ نہایت شائستہ، معتبر اور پُروقار شاعر ہونے کے علاوہ یہ تینوں محترم شخصیتیں اپنے خاندانی پس منظر رکھ رکھاؤ اور شخصی وقار کی وجہ سے بھی ممتاز تھیں۔ یہ محترم شاعرات مجھے بہت

ایک پسندیدہ شاعر کے علاوہ ایک مہذب انسان بھی سمجھتی تھیں۔

بانو طاہرہ سعید نے صالحہ الطاف سے میرا تعارف اس پُراعتماد اور پُرخلوص انداز میں کرایا کہ صالحہ الطاف مجھ سے متاثر ہوئیں اور مجھ سے گھر آنے کی خواہش کی۔ صالحہ الطاف کا " خاتونِ دکن " منظرِ عام پر آنے والا تھا۔ بانو طاہرہ سعید نے مشورہ دیا کہ نیّر صاحب کا تعاون آپ کے رسالے کے لئے نہایت مفید رہے گا۔ اُس ملاقات کے کچھ ہی دن بعد رویندرا بھارتی تھیٹر میں " خاتونِ دکن " کے پہلے شمارہ کی رسمِ اجراء تقریب ہونے والی تھی۔ رسمِ اجراء تقریب سے ایک دن پہلے صالحہ الطاف کے شوہر الطاف حسین دعوت نامہ دینے کے لئے سکریٹریٹ آئے۔ میں اپنی عادت کے مطابق چائے نوشی کے لئے کینٹین لے گیا۔ دورانِ چائے نوشی الطاف صاحب نے دعوت نامہ دیتے ہوئے اگلے شمارہ کے لئے غزل کی فرمائش بھی کی۔ میں حسبِ وعدہ دوسرے دن رویندرا بھارتی تھیٹر چلا گیا۔ رسمِ اجراء تقریب نہایت شاندار پیمانے پر ہوئی۔ اُس وقت کے گورنر آندھرا پردیش نے رسمِ اجراء انجام دی تھی۔ میرے خیال میں حیدرآباد میں کسی ادبی رسالہ کی تقریب رسمِ اجراء اس شاندار پیمانے پر منعقد نہیں ہوئی۔ اس محفل میں حیدرآباد کے بہت سے شاعر، ادیب، صحافی اور ممتاز شہری موجود تھے۔ تقریب کے بعد مبارکباد دینے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں مبارک باد دے کر خدا حافظ کہنے ہی والا تھا کہ صالحہ الطاف نے مجھ سے پھر اپنے گھر آنے کی خواہش کی۔ میں ۳، ۴ دن کے بعد صالحہ الطاف کے مکان واقع مگر کی باؤلی (میر عالم منڈی) پہونچا۔ جیسے ہی میں نے بیل دی، ملازمہ باہر آئی۔ میں نے

اپنا نام بتایا، وہ اندر چلی گئی۔ صالحہ الطاف کو میری آمد کی اطلاع دے کر حسب ہدایت، ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد صالحہ الطاف آئیں۔ آداب وسلام اور رسمی گفتگو کے بعد خاتونِ دکن کے بارے میں گفتگو رہی۔ رسالہ کے سلسلہ میں اس پہلی تفصیلی گفتگو کے دوران صالحہ الطاف نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے مجھے پہلی دفعہ ڈاکٹر اختر احمد کے مکان میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں کلام سناتے ہوئے دیکھا تھا۔ (ڈاکٹر اختر احمد سے ان کے خاندانی مراسم تھے) صالحہ الطاف نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر اختر احمد نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ پرچہ کی اشاعت، ترتیب وتزئین کے سلسلہ میں مجھ سے تعاون حاصل کریں۔ ڈرائنگ روم کی اس نشست میں صالحہ الطاف نے مجھ سے تعاون کی خواہش کی۔ میں نے وعدہ کرتے ہوئے پرچہ کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اگر آپ مجھ پر اعتبار کر سکتی ہیں تو میں چاہوں گا کہ رسالہ کی اشاعت کی ساری ذمہ داری مجھے سونپ دیں۔ البتہ تخلیقات کے انتخاب اور دیگر انتظامی امور میں ہم دونوں کا مشورہ شامل رہے گا۔ میں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ میں بلا معاوضہ کام کروں گا، مجلس ادارت میں بھی میرا نام نہیں رہے گا۔ اُس وقت ۳،۲ کاتبین رسالہ کی کتابت کرتے تھے۔ میں نے کتابت کے لئے محمد مظہر صاحب سے گفتگو کی۔ رسالہ بند ہوتے تک صرف انھوں نے ہی کتابت کی۔ مظہر صاحب اُن دنوں حیدرآباد کے ایک معیاری ادبی رسالہ ماہنامہ "صبا" کی کتابت کرتے تھے۔ وہ روزنامہ نظام گزٹ سے بھی وابستہ تھے (میرے پہلے مجموعۂ کلام "گلِ تازہ" کی کتابت بھی مظہر صاحب نے ہی کی ہے۔ خاتونِ دکن بلا وقفہ تقریباً

۱۲ سال تک شائع ہوتا رہا۔ جب میں نے خاتونِ دکن کا مکمل جائزہ حاصل کیا۔ تو صالحہ الطاف سے یہ بھی کہا کہ شاعروں اور ادیبوں سے میں خود خط وکتابت کروں گا، آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ میں نے اُردو کے نئے اور پُرانے قلم کاروں کو خطوط لکھے اور مجھے ان کا تعاون حاصل ہوتا رہا۔ مجھے صالحہ الطاف نے بتایا کہ خاتونِ دکن کی اشاعت کے سلسلہ میں حیدرآباد کے بعض شاعروں اور ادیبوں نے اپنے طور پر تعاون کا پیش کش کیا تھا لیکن ترجیحاً میں نے آپ کو اہمیت دی ہے۔ آپ میں، میں نے کچھ ایسی بات محسوس کی ہے کہ میں آپ پر بھروسہ کرسکتی ہوں۔ جب پرچہ کا کام بڑھنے لگا تو مجھے اکثر دفعہ صالحہ الطاف کے گھر جانے کا اتفاق ہونے لگا (چونکہ خاتونِ دکن کا آفس اُن کے گھر میں تھا) اُن دنوں صالحہ الطاف کو اُن کی تمام چھوٹی بہنیں، اختر سلطانہ، صبیحہ سلطانہ، صابرہ سعید اور عذرا سعید باجی کہا کرتی تھیں۔ اُن کے بھائی سلطان محمود، اور صمد فاروقی بھی باجی ہی کہا کرتے تھے لیکن میں نے اپنی الگ شناخت کیلئے باجی کے بجائے صالحہ آپا کہنا پسند کیا۔ آج بھی میں اس مقدس، پاکیزہ، اٹوٹ رشتہ سے وابستہ ہوں۔ رفتہ رفتہ مجھے اُس گھر سے کچھ ایسا تعلق پیدا ہوگیا کہ جیسے میں اُس گھر کا ایک فرد ہوں اور وہ لڑکیاں میری حقیقی بہنیں ہیں۔ صالحہ آپا کے غیر معمولی اعتماد نے مجھ پر کچھ اس قدر گہرا اثر چھوڑا کہ میں خاتون دکن کی بہتر سے بہترین اشاعت کیلئے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ صالحہ آپا نے مجھے مکمل اختیار دیا تھا کہ میں پرچہ کو اپنے ڈھنگ سے شائع کروں لیکن مجھے ہمیشہ اُن کا مشورہ اور تعاون حاصل رہتا تھا۔ رسالہ کا جائزہ لینے کے بعد میں نے کسی

وقت بھی صالحہ آپا کو پریس کے چکر لگانے کی زحمت نہیں دی، نہ ہی شاعروں اور ادیبوں سے خط و کتابت میں الجھایا۔ رسالہ کا سارا کام وہ گھر پر ہی دیکھ لیا کرتی تھیں۔ ایک دن صالحہ آپا نے شاعروں اور ادیبوں کے وہ سینکڑوں خطوط دکھلائے جو اُن کے نام آئے تھے۔ میں نے اُن تمام خطوط کو تلف کیا اور نئے سرے سے کام کا آغاز کیا۔ میں نے جب خطوط لکھنا شروع کیا تو مجھے حوصلہ افزا تعاون حاصل ہوتا رہا۔ ملک بھر کے نمائندہ شاعروں اور ادیبوں کے قلمی تعاون سے پرچہ دن بہ دن مقبول ہوتا گیا۔ اس پرچہ کو نام کی مناسبت سے صرف خواتین کی تخلیقات کے لئے ہی مختص نہیں کیا بلکہ خاتونِ دکن کو خالص ادبی رسالہ کی شکل دی گئی (جس میں مرد و خواتین قلم کاروں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں)۔ میری فرض شناسی اور احساسِ ذمہ داری کو صالحہ آپا نے ہمیشہ سراہا اور پرچہ کی اشاعت میں مجھ سے مکمل تعاون کیا۔ ہر ادبی رسالہ کی بقاء کے لئے اشتہارات ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر اس سلسلہ میں الطاف بھائی کا بھرپور تعاون حاصل نہ ہوتا تو شائد یہ پرچہ ۱۲ سال تک جاری نہ رہ پاتا۔ میں تقریباً ہر شام خاتونِ دکن کے آفس جاتا اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا۔

صالحہ آپا کی والدہ محترمہ میرا بہت خیال رکھتی تھیں (خدا انہیں جنت نصیب کرے) اس گھرانے نے مجھے پیار، محبت اور بے لوث خلوص سے سرشار کیا۔ اُس گھر کے ماحول نے مجھے اِس بات کا احساس ہی ہونے نہیں دیا کہ میں اس گھر کے لئے ایک اجنبی ہوں۔ میں خوشیوں، مسرتوں کے علاوہ اس گھر کے

دُکھ درد میں بھی برابر کا شریک رہا ہوں۔ صالحہ آپا نے اپنی بے لوث چاہت اور سچے خلوص میں کبھی کمی نہیں کی۔ اُن سے جب کبھی بھی ملتا ہوں تو مجھے شدت سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک مہذب، شائستہ خاتون سے مل رہا ہوں جنھوں نے اپنے منہ بولے بھائی کے لئے اپنی ساری محبت، ساری شفقت نچھاور کردی ہے۔ صالحہ آپا کو شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ میں خاتونِ دکن کا کام نہایت ذمہ داری اور اپنائیت کے ساتھ کررہا ہوں۔ اُنہیں اِس بات کا بھی احساس تھا کہ میں انہیں بہت چاہتا ہوں، اتنا زیادہ کہ خونی رشتے بھی ہاتھ ملتے رہ جائیں۔ صالحہ آپا کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ خاتونِ دکن کا بلامعاوضہ کام کرنے کے صلے میں مجھے تحفتہً ہی سہی کچھ نہ کچھ ملتا رہے (لیکن میں نے انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی)۔ اس کے باوجود صالحہ آپا نے غیر محسوس طریقہ سے مجھے ایک ایسے مقام پر شکست دیدی کہ میری ساری اَنا اور خود داری دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوگئی۔ صالحہ آپا نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا کہ میں ہمیشہ کے لئے اُن کے احسانات کے نیچے دب کر رہ گیا۔

معاشرہ میں اُن رشتوں کی زیادہ قدر کی جاتی ہے جو انسانی زندگی میں غیر محسوس طریقے سے مختلف اوقات میں، مختلف انداز اور مختلف روپ میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ (کائنات کے سارے کاروبار ایسے ہی نازک رشتوں پر قائم ہیں۔)

اللہ کا احسان ہے کہ میں معاشی طور پر ہمیشہ مطمئن رہا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میں نے یہ طے کیا تھا کہ اپنی زندگی اپنے انداز سے گذارنی چاہیئے۔

میں نے اپنی ساری زندگی میں نہ تو کسی کے سامنے سر جھکایا، نہ دستِ سوال دراز کیا۔ ہمیشہ اپنی خودداری کا بھرم قائم رکھا۔ اس کے باوجود بعض نازک و لطیف رشتوں نے مجھے بعض دفعہ مشکل مراحل سے بھی دوچار کیا، پھر بھی میں نے حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہ بات صالحہ آپا جانتی تھیں کہ میں کس قدر خوددار انسان ہوں۔ صالحہ آپا اس کوشش میں رہتیں کہ میری زندگی کے صبح و شام آسودگی کے ساتھ ساتھ باوقار اور پُراعتماد انداز سے گذرتے رہیں۔ معاشی طور پر میں اور زیادہ مستحکم رہوں۔ میرے بارے میں وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ سوچتی رہتیں۔ اُن ہی دنوں میرا پہلا لڑکا شمس الدین عارف، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے فرسٹ ڈیویژن میں ایم۔ایس سی کامیاب ہوا۔ عارف کی یہ خواہش تھی کہ وہ آئی۔اے۔ایس کے امتحان کی تیاری شروع کردے یا ڈاکٹریٹ کی تکمیل کے لئے اپنے ماموں کے پاس امریکہ چلا جائے۔ حیدرآباد میں الطاف بھائی نے عارف کو کچھ مہینے اپنے بزنس میں شامل کرلیا۔ اُس نے ذمہ داری سے اپنا کام شروع ہی کیا تھا کہ الطاف بھائی دوحہ قطر چلے گئے اور صالحہ آپا نے جانے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ عارف کو دوحہ قطر بلوانے کی راہ فراہم کی۔ اُس وقت (۱۰ سال پہلے) ایک ویزا کے حصول کے لئے تقریباً ۲۵ ہزار روپیے خرچ ہوا کرتے تھے لیکن صالحہ آپا نے میری محنت، میرے خلوص کا پُراثر انداز میں جواب دیا۔ عارف کے لئے ایک کمپنی میں ملازمت کا انتظام کیا، ایک دن عارف کا ویزا اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ آگیا اور وہ دوحہ قطر چلا گیا۔ یہ سب کچھ کمپنی کی جانب سے ہوا، عارف کا کچھ خرچ نہیں ہوا۔ آج الحمدللہ عارف کی ملازمت کی وجہ سے ہمیں عصری ضروریات کی وہ تمام

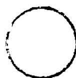
سہولتیں مہیا ہیں جو ایک خوشحال گھرانے کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ عارف کیمیکی کے ایک ممبر کی حیثیت سے پُرسکون اور مطمئن زندگی گذار رہا ہے۔

میری منہ بولی بعض بہنوں کا خیال ہے کہ میں جب کسی کو زیادہ چاہتا ہوں تو مجھے اُن سے لڑنے میں کچھ زیادہ ہی لطف آتا ہے۔ صالحہ آپا سے کبھی کبھی میں اُلجھتا رہتا تھا، یہ بات گھر کے سبھی لوگ جانتے تھے۔ ایک دفعہ میری اہلیہ نے بتایا کہ صالحہ آپا کی والدہ مجھے بہت عزیز رکھتی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں، نیّر میاں صالحہ سے کبھی کبھی اُلجھتے رہتے ہیں، خفا خفا سے رہتے ہیں، اس کے باوجود وہ صالحہ کے پاس آتے ہیں۔ نیّر ہیں بڑی محبّت والے، میرے گھر کے ایک فردِ خاندان کی طرح۔ ایک دن صالحہ آپا اور اُن کے گھر کے لوگوں نے جب یہ جاننا چاہا کہ میرے گھر میں کون کون رہتا ہے، تو ایک روز ابتدائی تعارف کے طور پر میں نے اپنے تیسرے لڑکے منہاج الدین خسرو کو (جو اُس وقت ایک سال کا ہوگا) صالحہ آپا کے گھر لے گیا اور اس کو دروازہ پر چھوڑ دیا۔ منہاج الدین خسرو کم سنی میں بے حد خوبصورت اور صحت مند تھا (آج بھی وہ ویسا ہی ہے)۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو خوشی سے گھر کے تمام لوگ اُس کو پیار کرنے لگے، پھر انہوں نے یہ جاننا چاہا کہ اتنے خوبصورت بچہ کو کون چھوڑ گیا ہے۔ بچّہ کو گھر کے دروازہ پر چھوڑ کر میں خاموشی سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا تھا۔ جب گھر والوں کو یہ معلوم ہوا کہ میرا لڑکا ہے تو صالحہ آپا نے ایک تحفہ اُس کے ہاتھ میں تھمایا اور پھر اُسے میرے پاس لے آئیں۔ منہاج کو خوب پیار کیا۔ منہاج تھا بھی اِس قدر خوبصورت، پُرکشش اور صحت مند کہ جو بھی اُس کو دیکھتا اُس سے پیار

کرنے لگ جاتا۔ میرے خاندان سے اُس پہلے تعارف کے بعد میری اہلیہ صالحہ آپا کے گھر کبھی کبھی جایا کرتیں۔ (خاص خاص موقع پر)

اتنے طویل عرصہ کے بعد بھی صالحہ آپا کی محبت اور اُن کے سلوک میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی۔ صالحہ آپا بعد میں میرے علمی و ادبی کاموں میں دلچسپی لینے لگیں۔ میری شاعری کی جہاں وہ مداح ہیں وہیں وہ مبصّر اور نقاد بھی ہیں۔ میرے پہلے مجموعۂ کلام "گُلِ تازہ" کی ترتیب و تزئین کی ساری ذمہ داری صالحہ آپا نے اپنے سر لی تھی۔ ایک ایک غزل کا جائزہ لیا اور مناسب انداز سے مجموعہ ترتیب دیا۔ کتاب کو مزید دیدہ زیب بنانے کیلئے اپنی چھوٹی آرٹسٹ بہن عذرا سعید سے مرقعے بنوائے، مرقعوں کی مناسبت سے مجھ سے شعر کہلوائے۔ بہترین سرورق تیار کروایا اور بہترین گٹ اَپ کے ساتھ "گُلِ تازہ" شائع ہوا۔ صالحہ آپا کے مشورہ سے کتاب کی قیمت صرف ایک روپیہ رکھی گئی تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ہاتھوں میں رہے۔ کتاب کی ایک ہزار جلدیں دو ڈھائی مہینے میں آوٹ آف اسٹاک ہوگئیں۔ صالحہ آپا نے "گُلِ تازہ" کی تقریباً تمام غزلیں مصرعِ طرح دے کر لکھوائیں۔ صالحہ آپا کو شعر و سخن کا نہایت عمدہ اور نکھرا ستھرا ذوق ہے، یہ ذوق انہیں اپنے ورثے میں ملا ہے۔ صالحہ آپا کے والد محترم احمد سعید صاحب علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے، جو واڑی میں سنگِ سیلو کے تاجر اور معدنیات کے مالک تھے۔ روزنامہ 'میزان' کے ایڈیٹر حبیب اللہ اوج، صالحہ الطاف کے حقیقی چچا ہیں (جو پاکستان کے شہری ہیں)۔ صالحہ الطاف کا سارا گھرانہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ سارے گھر پر مشرقی آداب

اور دینی ماحول کا گہرا اثر ہے ۔ وہ ایک اچھی ادیب اور ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ ادبی و مذہبی کتابوں کا وسیع مطالعہ ہے، ان کا زیادہ وقت ادبی و دینی کتب کے مطالعہ میں گذرتا ہے۔ نہایت بُرد بار، سنجیدہ، سلیقہ شعار اور پُر وقار شخصیت کی مالک ہیں ۔ میرے تمام شعری مجموعوں کی ترتیب و تزئین میں صالحہ آپا کی مشاورت شامل رہی ہے ۔ الطاف بھائی ایک بزنس مین ہیں انہیں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ سید اویس سرمد سوئزرلینڈ میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔ اُس نے ایک نہایت خوب صورت و خوب سیرت اسپینش (اسپین کی رہنے والی) لڑکی مریم سے شادی کی ہے۔ الطاف بھائی کی پہلی لڑکی نوشینہ اریب ڈاکٹر ہے، جو بنگلور میں مقیم ہے، دوسری لڑکی ثمیرہ اسمیٰ بی۔ ڈی ایس کی طالبہ ہے، یہ بھی بنگلور میں مقیم ہے ۔ صالحہ آپا اِن دنوں محلہ اے سی گارڈ کے ایک مکان میں رہتی ہیں، الطاف بھائی کا آفس بھی اسی گھر میں ہے۔ الطاف بھائی اور صالحہ آپا میں ذہنی ہم آہنگی ہے، وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں، نہایت مطمئن زندگی گذار رہے ہیں۔ میں نے اپنے جذباتی اور پاکیزہ رشتہ کے تسلسل کی برقراری کے لئے اپنے ۸ ویں مجموعۂ کلام " یہ کیسا رشتہ ہے " کا انتساب صالحہ آپا کے نام کیا ہے۔ ــ ــ



رُخسانہ (ڈاکٹر صابرہ سعید)

۱۴ ، ۱۵ برس کی مشرقی ماحول کی پروردہ ایک سنجیدہ، متین ، خوش جمال اور خوش مزاج سیدھی سادی لڑکی رخسانہ کو میں نے پہلی بار اُس وقت دیکھا جب وہ یہ کہنے کے لئے گھر سے باہر آئی تھی کہ صالحہ باجی گھر پر نہیں ہیں اور یہ کہا ہے کہ آپ کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دوں ۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا انتظار کرتا رہا ۔ اُس وقت رخسانہ اسکول کا ڈریس (گرین شرٹ اور سفید پاجامہ) زیب تن کئے ہوئی تھی ۔ عثمانیہ میٹرک اور علی گڈھ میٹرک کی تیاری ایک ساتھ کر رہی تھی ۔ صالحہ آپا سے جو میرا رشتہ ہے اُس کی توسیع کے لئے صبیحہ، رخسانہ اور عذرا بھی مجھے یٰسؔر بھائی کہا کرتی تھیں ۔ صبیحہ ، صالحہ آپا کی تیسری چھوٹی بہن ہے (جو امریکہ میں رہتی ہے) صبیحہ ابتدا سے کم آمیز رہی ۔ البتہ رخسانہ اور عذرا مجھ سے ملتی رہتی تھیں ۔ رخسانہ کا ترنم بے حد پُر اثر ہے ۔ رخسانہ کے ترنم کا مجھ پر گہرا اثر ہے ۔ میں اپنی بعض غزلیں اب بھی رخسانہ کے ترنم میں سُنتا ہوں ۔ عذرا ایک بہت اچھی آرٹسٹ ہے ۔ میرے تمام شعری مجموعوں کے سرِ ورق عذرا نے ہی تیار کئے ہیں ۔ (اُس نے جامعہ عثمانیہ سے سوشیالوجی میں ایم ۔ اے کیا ہے ، جدید لب و لہجہ کی شاعرہ بھی ہے) ۔ میں اپنی بہنوں کی

چھوٹی چھوٹی فرمائشوں اور خواہشوں کا خیال رکھتے ہوئے ان کے لئے اچھی اچھی کتابیں لے آتا۔ جب میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ ایل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا تو رخسانہ مجھے انگلش کے نوٹس تیار کر کے دیا کرتی تھی۔ خاندان کی دوسری لڑکیوں کی طرح رخسانہ کی بھی شادی ہو گئی اور وہ سسرال چلی گئی۔ بہن چاہے میکے میں رہے یا سسرال میں، بھائی بہن کا رشتہ کبھی ٹوٹتا نہیں اور مستحکم ہو جاتا ہے۔ رخسانہ کی شادی ۱۷، ۱۸ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد رخسانہ نے جامعہ عثمانیہ سے اُردو میں ایم۔ اے کیا۔ پروفیسر مغنی تبسم بھی ان کے اُستادوں میں شامل تھے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد رخسانہ نے پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ پروفیسر غلام عمر خان اُس کے گائیڈ تھے لیکن مقالہ کی تکمیل کے تمام مرحلے مغنی تبسم کی مشاورت اور تعاون سے انجام پائے۔ مقالہ کی ترتیب و تزئین اور ٹائپ کے مرحلوں میں، میں نے رخسانہ کا ساتھ دیا۔ رخسانہ کو پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ رخسانہ کی بہن اختر سلطانہ کے گھر واقع بشیر باغ پر ایک پُر تکلف عصرانہ دیا گیا تھا جس میں پروفیسر گیان چند جین ڈاکٹر غلام عمر خان، ڈاکٹر مغنی تبسم، سمیع بھائی اور خاندان کے دیگر اصحاب موجود تھے۔ وہ شام بڑی خوشگوار تھی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ ایک ہی خاندان کے لوگ برسوں بعد ایک جا جمع ہو گئے ہیں۔

اُس زمانے میں سکریٹریٹ کے محکمۂ تعلیمات سے اُردو مسودات اور مقالوں کی اشاعت کے لئے بھی گرانٹ دی جارہی تھی (میں اُن دنوں سکریٹریٹ میں تھا) میں نے رخسانہ کا مقالہ "اُردو ادب میں خاکہ نگاری" گرانٹ کے لئے پیش

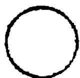
کیا تھا۔ جس کی اشاعت کے لئے ۲ ہزار روپے حکومت نے منظور کئے تھے۔ میں نے مقالہ کو کتابی شکل دینے کی راہ نکالی۔ کتاب شائع ہوگئی جس پر اتر پردیش اُردو اکیڈیمی نے انعام سے نوازا۔ ڈاکٹریٹ کے بعد رخسانہ نے اپنا علمی و ادبی کام جاری رکھا۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے اُردو ادب کے مختلف موضوعات پر تقریریں نشر کرتی رہیں۔ دوردرشن سے مباحث میں حصّہ لیا۔ روزنامہ سیاست کے علاوہ ملک کے ادبی رسائل میں خاکہ نگاری کے مختلف پہلوؤں اور دیگر ادبی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہے۔ رخسانہ تقریباً ۵ سال تک شعبۂ اُردو جامعۂ عثمانیہ سے وابستہ رہیں۔ شہر کے مختلف کالجس میں پارٹ ٹائم لکچرر کی حیثیت سے درس دیتی رہیں۔ اس وقت سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن میں ایک لکچرار کی حیثیت سے کام کرتی ہیں۔ رخسانہ شاعری بھی کرتی ہیں لیکن چھپوانا نہیں چاہتیں۔ رخسانہ کی شخصیت میں وہ تمام اعلیٰ خصوصیات شامل ہیں جو ایک مہذب، شائستہ اور باوقار خاتون کا حصّہ ہوتی ہیں۔

رخسانہ کم عمری ہی میں اپنی زندگی کے پہلے اور آخری ساتھی سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محروم ہوگئیں۔ جب یہ المناک، ناقابل یقین المیہ پیش آیا تو رخسانہ بری طرح ٹوٹ گئیں۔ اس کو سنبھلنے کے لئے کئی برس لگے۔ سمیع بھائی ایک کامیاب شوہر، کامیاب دوست اور ایک اعلیٰ درجے کے انسان تھے۔ نہایت وجیہہ معتبر، نفیس اور ہنس مکھ شخصیت کے مالک بھی۔ اُن میں ایسا بانکپن تھا کہ اُن پر جب نظر جم جاتی تو ہٹتی ہی نہیں تھی۔ وہ عین عالم جوانی میں (لگ بھگ ۴۰، ۴۲ سال) کی عمر میں گردے کے عارضہ میں مبتلا ہوکر ابدی نیند سوگئے۔ وہ

ہم سے رخصت ہوئے تو ازمان (محمد خلیل اللہ) رخسانہ کی انگلی تھامے ہوئے کھڑا تھا اور عرشیہ بلقیس، رخسانہ کی گود میں تھی۔ رخسانہ نے زندگی کا باقی طویل سفر تنہا طے کرنے کے لئے اُسی وقت عہد کیا تھا جب سمیع بھائی کی نظریں آخری بار رخسانہ کو دیکھتے ہوئے ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔ سمیع بھائی میری بہت عزت کرتے تھے۔ جب میں رخسانہ کے ادبی کاموں اور اس کے کالج کی مصروفیات میں دلچسپی لیتا تو انہیں بہت خوشی ہوتی تھی۔ میرے مخلصانہ رویے سے وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ سلطان محمود ز... اور صمد فاروقی کی طرح میں بھی ان کا نسبتی برادر ہوں۔

میں اب بھی رخسانہ سے ملنے کے لئے اُس کے گھر جایا کرتا ہوں، اُس کا خیال پوچھتا ہوں، اسی طرح جیسے ایک بھائی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ میں اُس اندوہناک لمحہ کو آج تک بھول نہیں پایا جب میں پُرسہ دینے کے لئے رخسانہ کے گھر گیا تھا تو اُس نے مجھے بھی اپنی طرح آنسوؤں کے سمندر میں ڈبو دیا تھا۔

--



فاطمہ نسرین

ہر شخص کو اپنی زندگی میں کچھ ایسے انسانی رشتوں سے بھی تعلق رہتا ہے جن کو کوئی خاص نام نہیں دیا جاسکتا۔ بظاہر بعض رشتے اس قدر اعلیٰ و ارفع ہوتے ہیں کہ جن کی شناخت سے بھی رشتوں کا وقار متاثر ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک رشتہ سے مجھے بھی سابقہ پڑا تھا۔ اُس رشتہ کو کوئی ایک اچھا سا نام دینے کے لئے مجھے بہت دن لگے اور اُس رشتہ کی پاکیزہ شکل فاطمہ نسرین ہے۔ گُلِ تازہ کی طرح مہکنے والی شخصیت نے مجھے کچھ اس طرح متاثر کیا تھا کہ میں نے اُس ایک رشتہ میں تمام انسانی رشتوں کو تسبیح میں پروئے ہوئے دھاگوں کی طرح پایا۔

فاطمہ نسرین سے میری پہلی ملاقات ویمنس کالج، سلطان بازار، کوٹھی کے اسٹاف روم میں اُس وقت ہوئی جب میں صدر بزم اُردو ویمنس کالج، سے ملنے کے لئے گیا تھا۔ میرے ہمراہ نظام کالج کے طالب علم صادق نقوی (ڈاکٹر صادق نقوی، ریڈر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ) بھی تھے۔ چونکہ میں پہلی دفعہ ویمنس کالج جارہا تھا، اس لئے صادق نقوی میرے ساتھ تھے۔ وہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت سے واقف تھے، مجھے معلوم تھا کہ بزم اُردو کی منتظم، اُردو کی لکچرر ڈاکٹر ثمینہ شوکت

ہیں۔ میں اُن دنوں اُردو کالج میں بی۔او۔ایل کا طالبعلم تھا اور بزمِ اُردو ادب کا صدر بھی۔ بین کلیاتی بیت بازی کے مقابلے میں شرکت کی دعوت دینے کے لئے میں گیا تھا۔ اُردو کالج میں اُن دنوں بین کلیاتی بیت بازی کے مقابلے منعقد ہونے والے تھے۔ جب میں نے ثمینہ شوکت صاحبہ سے خواہش کی کہ میں صدر بزمِ اردو ویمنس کالج سے ملنا چاہتا ہوں تو انہوں نے فاطمہ نسرین کو بلا بھیجا اور مجھ سے تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ یہ فاطمہ نسرین ہیں۔ یہی صدر بزمِ اُردو ہیں۔ مختصر تعارف کے بعد ویمنس کالج کی ٹیم کی تفصیل حاصل کرنے کے بعد جب میں لوٹ رہا تھا تو یوں محسوس ہوا کہ اس لڑکی سے میرا کسی نہ کسی قسم کا رشتہ ہے۔ فاطمہ نسرین اپنی ٹیم کے ساتھ اُردو کالج آئیں۔ دوسری ملاقات کچھ دنوں بعد ہی "بیادِ محمد قلی قطب شاہ تقاریب" کے سلسلہ میں ہوئی جہاں بیت بازی کا فائنل مقابلہ منعقد ہونے والا تھا۔ مجھے پھر ویمنس کالج جانا پڑا فاطمہ نسرین سے ملاقات ہوئی۔ کچھ دن گذرنے کے بعد فاطمہ نسرین نے میرے نام اپنے کالج کی سالانہ تقریب کا دعوت نامہ بھجوایا۔ میں اپنے آفس (سکریٹریٹ) کے ساتھی افضل حسین (ممتاز کاظمی) کو ساتھ لے کر اُس وقت ویمنس کالج پہونچا جب فنکشن ختم ہوچکا تھا۔ مختلف کالجس کے طلباء و طالبات اور اساتذہ واپس ہو رہے تھے۔ سب سے آخر میں جانے والی مہمانِ خصوصی رفیعہ سلطانہ تھیں۔ فاطمہ نسرین دربار ہال کی بائیں جانب کی سیڑھیوں کے پاس کھڑی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی میں پہونچا ان کے چہرے پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی اور مجھے اپنے ہمراہ ریفرشمنٹ روم میں لے گئیں، وہاں ہم نے چائے پی۔

ویمنس کالج کی سالانہ تقریب سے پہلے محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں گنبد محمد قلی قطب شاہ پر بیت بازی کا فائنل مقابلہ تھا۔ جس میں ویمنس کالج کی ٹیم نے مقابلہ جیت لیا۔ اُردو کے ممتاز محقق ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے مجھے ان مقابلوں کا کنوینر مقرر کیا تھا۔ جگن ناتھ آزاد نے اقبال کا ایک شعر سنا کر بیت بازی کے مقابلہ کا آغاز کیا تھا۔ جب ہم لنچ کے لئے جمع ہوئے تو ان لڑکیوں کے پاس صرف کاپیاں، کتابیں اور قلم تھے (کھانے کیلئے کچھ بھی نہیں تھا) میں نے انہیں لنچ میں شریک ہونے کے لئے اصرار کیا۔ فاطمہ نے مجھ سے کہا کہ ہمارے پاس ٹفن ہے، جب میں نے ٹفن باکس دیکھنا چاہا تو میرے ہاتھ سے ڈبہ گر گیا۔ ڈبہ میں فونٹن پن، پنسل اور کچھ روپے تھے۔ اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے اُن لڑکیوں کو بہ اصرار لنچ میں شریک کیا۔ جب تقسیم انعامات کا سلسلہ ختم ہوا تو اُس وقت شام کے کوئی ساڑھے نو بج رہے تھے۔ تقریب ختم ہونے کے بعد ان لڑکیوں کو پہونچانے کی میری ذمہ داری تھی۔ غالباً چاند کی ۱۳ ویں یا چودھویں تاریخ تھی، بس کے لئے ہمیں گنبد محمد قلی قطب شاہ سے بالا حصار تک پیدل جانا پڑا۔ اُس وقت چاندنی زمین پر دودھ کا دریا بہا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہم لوگ دودھ کی چادر میں لپٹے ہوئے ہیں۔

کالج کی وداعی تقریب کے بعد فاطمہ سے میری یہ آخری ملاقات تھی فاطمہ نے بی۔اے کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں ایم۔اے جغرافیہ میں داخلہ لے لیا۔ تقریباً ایک سال تک فاطمہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک دن ہاشم نے

کے ذریعہ ایک چٹھی ملی۔ ہاشم نے وہ چٹھی مجھے اُردو کالج کے ایک فنکشن کے دوران دی تھی۔ فاطمہ نے گھر آنے کے لئے لکھا تھا۔ میں فاطمہ کے گھر گیا' اُس کو میری آمد سے بہت خوشی ہوئی۔ فاطمہ نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں اُس کی چھوٹی بہن فرخ کے لئے بی۔اے اُردو کے نوٹس تیار کروں' چونکہ امتحان قریب تھے اس لئے میں نے رات دیر تک جاگ جاگ کر نوٹس تیار کئے۔ فرخ اچھے نمبرات کے ساتھ پاس ہوگئی۔ اس کے بعد مجھے کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں فاطمہ سے ملنے کے لئے جانے کا اتفاق ہوتا رہا۔ اب ہماری ملاقاتیں اور بڑھنے لگیں۔ فاطمہ نے ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ ایم۔ اے کے ایک پرچہ کے سلسلے میں کچھ فارسی مخطوطات دیکھنا ضروری تھا۔ فاطمہ یونیورسٹی سے اسٹیٹ لائبریری آتی اور میں وہاں موجود رہتا۔ میں نے اُس زمانے میں فاطمہ کی بہت مدد کی۔ فاطمہ فارسی سے ناواقف تھی اور میں فارسی جانتا تھا' اس لئے میرا تعاون اُسے درکار تھا۔ کبھی کبھی میں عثمانیہ یونیورسٹی بھی چلا جاتا۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ میں فاطمہ نسرین سے ملنے کے لئے جغرافیہ ڈپارٹمنٹ چلا گیا۔ فاطمہ کی کلاس چل رہی تھی' جیسے ہی میں کلاس میں داخل ہوا' متعلقہ پروفیسر نے سوال کیا' آپ کو کس سے ملنا ہے۔ میں نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ' فاطمہ سے۔ یہ میری بہن ہے۔ فاطمہ کلاس روم سے باہر آئی اور مجھ سے کہا' یہاں مختلف رشتوں کے نام سے طالب علم آتے ہیں اور طالبات سے ملتے رہتے ہیں۔ اس لئے اساتذہ کے ذہن میں مختلف سوالات اُبھر کر آتے ہیں۔ آپ تو میرے بھائی ہیں — فاطمہ کے اس آخری جملہ نے میری نس نس میں خوشبو کی لہر دوڑا دی۔ فاطمہ کے دو بھائی ہیں۔ دونوں

گزیٹیڈ پوسٹ پر تھے۔ اگزیکیٹو آفیسر ہونے کی وجہ سے وہ دونوں زیادہ تر اضلاع پر رہتے تھے۔ فاطمہ کو ایک بھائی مل گیا۔ وہ اس بھائی کی بے حد نگر ہو گئی تھی وہ اپنی زندگی کے ہر مرحلہ پر مجھ سے مشورہ کرتی۔ فاطمہ کو اُردو شعر و ادب کا اچھا خاصا ذوق ہے، وہ شعر بھی کہتی ہے۔ نسرین تخلص ہے۔ اس تخلص کو حیات جاوید بخشنے کے لئے میں نے اپنی چھوٹی لڑکی کا نام زینت نسرین رکھا ہے۔ میری پہلی لڑکی طلعت سلطانہ فاطمہ کی شاگرد رہی ہے جبکہ فاطمہ حسینی علم گرلز کالج میں بحیثیت استاد کام کر رہی تھی۔ میرے کہنے پر فاطمہ 'محفل خواتین' سے وابستہ ہوگئیں۔ محفل خواتین کی پہلی غزلوں کی رات' میں ممتاز گلوکار امیر محمد خاں نے فاطمہ کی غزل پُر اثر آواز میں سنا کر ایک سماں باندھ دیا تھا۔ وہ یادگار غزلوں کی رات' ہر اعتبار سے ناقابلِ فراموش ہے۔ ایم۔اے کرنے کے بعد فاطمہ' محکمہ تعلیمات میں بہ حیثیت ٹیچر ملازم ہوگئی۔ اُس کی تعیناتی عالیہ اسکول میں ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد حسینی علم گرلز کالج پر اس کا تبادلہ ہوگیا' وہاں سے کچھ مہینے بعد علی آباد (انجن باؤلی) کے ایک اسکول پر اس کی پوسٹنگ ہوئی۔ وہ پریشان ہوگئی۔

مجھے فون کیا۔ اُن دنوں مرزا سرفراز علی صاحب ڈی۔ای۔او' تھے جو مجھے شاعر کی حیثیت سے بہت پسند کرتے تھے۔ میں نے دوسرے دن سرفراز صاحب کو تبادلہ کی منسوخی کے لئے فون کیا' معلوم ہوا کہ وہ لنچ کے لئے گھر گئے ہوئے ہیں۔ میں نے گھر پر فون کیا' وہ دوران لنچ فون پر آئے' اُن سے تبادلہ کی منسوخی سے متعلق بات ہوئی۔ سرفراز صاحب نے کہا کہ آج شام ۴ بجے کسی کو آفس بھجوا کر آرڈر منگوا لیجئے۔ یہ سُن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اُس وقت ڈی۔ای۔او آفس

کاچی گوڑہ میں واقع تھا۔ میں خود آفس پہونچا۔ متعلقہ منتظم نے کہا کہ ڈی۔ای او صاحب انسپکشن کے لئے گئے ہوئے ہیں اور مجھ سے کہا ہے کہ یہ آرڈر آپ کے حوالے کردوں۔ آرڈر کی ایک زائد کاپی لینے کے بعد میں نے فاطمہ کو گھر پر فون کیا۔ خوش خبری سنائی۔ جب میں اس کے گھر پہونچا تو میز پر مٹھائی کا ڈبہ موجود تھا۔ میرے اس کارنامے سے فاطمہ کے دل میں میری عزت اور بڑھ گئی۔ بھائی بہن کا رشتہ اور مضبوط ہوگیا۔

میں نے اپنے مجموعہ کلام "گلِ تازہ" کی اشاعت کے موقع پر فاطمہ سے کتاب کے نام کے بارے میں مشورہ لیا تو کہا "گلِ تازہ" رکھ دیجئے۔ اچھا نام ہے، جھلکتا ہوا سا۔ اور میں نے "گلِ تازہ" نام رکھ دیا۔ فاطمہ نسرین نے اپنی تمام غزلوں پر مجھ سے اصلاح لی ہے اور میں نے اس کی بہت سی غزلیں ماہنامہ "خاتونِ دکن" میں شائع کی ہیں۔

فاطمہ اس قدر نفیس، سیدھی سادی، پُر وقار شخصیت کی مالک ہے کہ اُس نے کبھی اپنے رکھ رکھاؤ اور اپنی شخصیت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ اس نے ہمیشہ مشرقی آداب اور مشرقی تہذیب کی پاسداری کی ہے۔ نہایت مہذب، شائستہ اور پُر وقار لہجے میں گفتگو کیا کرتی ہے۔ بانو طاہرہ سعید نے فاطمہ کو جب "غزلوں کی رات" کے موقع پر دیکھا، تو مجھ سے کہا تھا کہ اس لڑکی میں تو مغنیہ حسن ہے۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ کبھی کبھی فاطمہ کے گھر جاتا۔ گھریلو مراسم اور بڑھنے لگے۔ فاطمہ کی والدہ مجھ سے بے حد متاثر ہیں، وہ مجھے اپنا تیسرا بیٹا سمجھتی ہیں۔ اُن کو اندازہ ہے کہ میں فاطمہ کا بہت خیال

رکھتا ہوں۔

اُن دنوں جب فاطمہ کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ ایک دن فاطمہ نے مجھے بلوایا اور اپنے رشتے کے بارے میں میری رائے مانگی۔ میں نے کہا، جب تمہاری والدہ، بھائی، افرادِ خاندان اس رشتہ کو تمہارے لئے مناسب سمجھتے ہیں تو تم اس رشتہ کو قبول کرلو اور جہاں تک تم نے مجھے تفصیل بتلائی ہے میرے خیال میں تمہارے لئے یہ رشتہ موزوں رہے گا۔ تم ہاں کہہ دو۔ فاطمہ کی شادی ہوگئی اور وہ ایک سال کے بعد اپنے شوہر کے ہاں شکاگو (امریکہ) چلی گئی۔ فاطمہ کی شادی کے اہتمام میں دوسرے بھائیوں کی طرح پوری دلچسپی اور خلوص کے ساتھ میں نے بھی حصہ لیا۔ شادی سے پہلے بعض فیصلے میرے گھر (گھانسی بازار) میں ہوتے۔ دیگر رشتہ داروں کے مقابلے میں شادی کی تقریب میں، میں ہی پیش پیش رہا۔ اور ایک بہن کو خدا حافظ کہنے والے بھائیوں کے ساتھ میں بھی خاموش بادیدۂ نم کھڑا رہا۔

فاطمہ گذشتہ ۱۷، ۱۸ سال سے امریکہ میں ہے، دو تین سال میں ایک دفعہ حیدرآباد آتی ہے اور اپنی والدہ کے یہاں ٹھہرتی ہے اور جب تک حیدرآباد میں رہتی ہے میں اُس سے ملتا رہتا ہوں۔ دو سال پہلے جب حیدرآباد آئی تھی تو اُن ہی دنوں میرے بڑے لڑکے شمس الدین عارف کی شادی ہوئی۔ فاطمہ نے اپنے بچوں کے ساتھ شرکت کی تھی اور عارف کو اس کی دولہن کو ڈھیر ساری دعائیں دے کر واپس ہوئی۔ فاطمہ کے شوہر شکاگو میں ایک اچھی خدمت پر فائز ہیں۔ فاطمہ جب بھی حیدرآباد آتی ہے تو میرے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لاتی ہے۔

گذشتہ بار جب حیدرآباد آئی تو اپنے شوہر کے مشورہ سے مجھے ایک قیمتی تحفہ دیا تھا۔ فاطمہ ہنستے ہوئے آتی ہے اور روتی ہوئی جاتی ہے۔ میری زندگی کے بہت سے روشن لمحے فاطمہ کو روشن اور تابناک دیکھنے میں گذرتے رہے ہیں۔

اُس کی شادی کے موقع پر میں نے صرف ایک نظم تحفتاً دی تھی۔ شادی کے کچھ دن بعد جب میں اپنی اہلیہ کے ساتھ فاطمہ سے ملنے کے لئے اس کے سسرال گیا تو اُس نے اپنے کمرہ میں ہم دونوں کو بلوایا اور مجھے وہ فریم کی ہوئی تہنیتی نظم دکھلائی جو اس کے ... کی دیوار پر آویزاں تھی۔

محبت چاہے ... و روپ میں ہو، وہ اپنا گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ محبت کی ایک شکل ایسی بھی ہے جو تمام انسانی رشتوں سے اعلیٰ و ارفع ہے۔

اب کی بار فاطمہ نسرین دو سال کے بعد امریکہ سے حیدرآباد آئی تھی۔ حُسنِ اتفاق کہیے کہ اس بار بھی میرے تیسرے لڑکے منہاج الدین خسرو کی شادی میں فاطمہ نے شرکت کی۔ اس دفعہ اُس نے ایک اچھا کام یہ کیا کہ اپنا مجموعۂ کلام "بہاروں کی منزل" شائع کیا۔ جب میں فاطمہ سے ملنے کے لئے اس کی نہال کے گھر گیا تو اُس نے کتاب کی اشاعت کی تجویز رکھی۔ فاطمہ نے مختلف اوقات میں کہی ہوئی تخلیقات جو منتشر شکل میں تھیں، جمع کیا تھا۔ اس کتاب میں شامل بہت سی نظمیں اس نے اپنے قیامِ حیدرآباد کے دوران ہی کہی ہیں۔

"بہاروں کی منزل" میں دینی اور مذہبی شاعری کے علاوہ موضوعاتی کلام اور منتخب غزلیں بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب تین ہفتوں کی مسلسل کدو کاوش کے بعد

نہایت دیدہ زیب و خوبصورت شکل میں منظر عام پر آگئی ہے۔

"بہاروں کی منزل" کی رسم اجراء تقریب ۱۹ راگست ۱۹۹۱ء کو ممتاز شاعرہ انجم قمر سوز کی رہائش گاہ (انجمن قمر۔ ملے پلی) میں حیدر آباد کی منتخب تعلیم یافتہ خواتین کی موجودگی میں ممتاز نقاد و ادیب محترمہ صالحہ الطاف مدیر خاتونِ دکن کے ہاتھوں انجام پائی۔ اردو، فارسی اور انگریزی کی نامور شاعرہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے صدارت کی تھی، جبکہ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے مشہور اہلِ قلم خواتین محترمہ فاطمہ علی خاں معتمد محفلِ خواتین، ڈاکٹر اختر سلطانہ، انجم قمر سوز، ڈاکٹر صابرہ سعید اور قمر جمالی نے فاطمہ نسرین کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔ اظہارِ تشکر کے طور پر فاطمہ نسرین نے بھی مخاطب کیا۔ صالحہ الطاف اور بانو طاہرہ سعید نے بھی اپنے تاثرات پیش کئے۔ ممتاز افسانہ نگار و ادیب محترمہ انیس قیوم فیاض نے نہایت عمدگی سے جلسے کی کارروائی چلائی۔ ادبی اجلاس کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں صدر مشاعرہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کے علاوہ محترمہ انجم قمر سوز مظفر النساء ناز، قمر جمالی، فاطمہ نسرین اور ریشماں (بنت عبدالحق) نے کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ محترمہ مظفر النساء ناز شریک معتمد محفلِ خواتین نے سلیقہ کے ساتھ معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ اس تقریب میں صرف خواتین شریک تھیں۔ تقریب سے متعلق تمام انتظامات راقم الحروف کی نگرانی میں انجام پائے۔ انجم قمر سوز نے مجھ سے مکمل تعاون کیا، اور اپنی جانب سے اس تقریب کا ویڈیو کیسٹ مہمان شاعرہ فاطمہ نسرین کی خدمت میں پیش کیا۔ رسم اجراء تقریب کی خبر روزنامہ سیاست میں تین کالم کی سرخی کے ساتھ شائع ہوئی۔

ادبی حلقوں میں 'بہاروں کی منزل' کی اچھی خاصی پذیرائی ہوئی۔ فاطمہ تسنیم نے مخاطب کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ :-

"حیدرآباد میں مختصر قیام کے دوران میں بے حد مصروف رہی۔ بچوں کی اور میری صحت کی ناسازی کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ باقی وقت ملاقاتوں اور دعوتوں کی نذر ہو گیا۔ کتاب کی اشاعت پر توجہ اس وقت کی جبکہ امریکہ کو واپسی کا وقت قریب آگیا۔ میں نے نیّر بھائی (صلاح الدین نیّر) سے اس کا ذکر کیا۔ ابتداء ہی سے میں نے اپنے بھائیوں میں اُنہیں بھی حقیقی بھائی ہی کی طرح سمجھا۔ ان کے اعلیٰ کردار اور ان کے جذبۂ ہمدردی سے میں بہت متاثر ہوں۔ ان کی مقناطیس جیسی شخصیت نے میرے کاغذات کے ایک ایک پُرزہ کو سمیٹ کر یکجا کیا اور بہت کم وقت میں بہت گہری دلچسپی اور محنت سے، کلام کی تصحیح سے لیکر کتاب کی اشاعت تک سارے مراحل طے کئے۔ اس کرم فرمائی کے لئے میرے پاس شکریہ کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ ہاں میری دعائیں ہیں جو ان کے ساتھ ہمیشہ رہیں گی۔"



انجم قمر سوز

کچھ نام ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی معنویت کی وجہ سے سُننے والوں کو تجسس میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ انجم قمر سوز بھی ایک ایسا ہی نام ہے۔ اس نام کے پیچھے ایک ایسی شخصیت کا وجود جلوہ فرما ہے جو اپنی ہمہ جہتی خصوصیات کی وجہ سے نہ صرف اپنے خاندان بلکہ رشتہ داروں اور دوستوں میں بھی پسند کی جاتی ہے۔

جب میں نے پہلی دفعہ یہ نام سُنا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ شاید اس نام کے پیچھے کوئی غیر معمولی شخصیت ہوگی۔ انجم آپا مجھ سے عمر میں چھوٹی ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں میں نے انجم قمر سوز کے بجائے انجم آپا کہنے کو ترجیح دی (شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں اُن کا احترام بھی کرتا ہوں)۔ کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن سے پہلی ملاقات کے بعد ہی کسی نہ کسی رشتہ سے منسوب ہونے کو خود بخود جی چاہتا ہے۔

جب میں اپنے وطن تعلقہ ہمنا باد ضلع بیدر سے مڈل اسکول کی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے حیدر آباد آیا تو میں اپنی حقیقی بہن کے پاس

بسمری الاوہ (گھانسی بازار) میں رہا کرتا تھا ۔ میں اس محلہ میں کئی برس رہا ۔ ڈاکٹر قمرالدین نئے نئے ڈاکٹر ہوئے تھے جو میرے ہم محلہ تھے ۔ میری بڑی لڑکی طلعت سلطانہ کی طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے ایک دن میں ڈاکٹر قمر کے ہاں گیا ۔ ڈاکٹر قمرالدین مجھے ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے (یہ بات انھوں نے مجھے بعد میں بتائی)۔ جب میں اُن کے کلینک پہونچا تو وہ مجھ سے بہت خلوص سے ملے، بچی کو دیکھا اور دوائیں دیں ۔ جب میں فیس دے رہا تھا تو ڈاکٹر قمرالدین نے اپنی بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے ۔ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں آپ کی خدمت کرسکوں یہی میرے لیے کافی ہے ـــــــ ڈاکٹر قمرالدین سے یہ میری پہلی ملاقات تھی ۔ ابھی انجم آپا سے میرا تعارف نہیں ہوا تھا، البتہ مجھے معلوم تھا کہ میاں بیوی دونوں شاعر ہیں ۔ اُن دنوں میں "بزمِ حیوان" کے مشاعروں میں بھی شریک ہوا کرتا تھا ۔ ایک مشاعرہ میں، میں نے انجم قمر سوز کو پردے کے پیچھے سے پُرسوز ترنم کے ساتھ کلام سُناتے ہوئے سُنا ۔ اُس نئی شاعرہ کا کلام اور ترنم مجھے پسند آیا ۔ کچھ دن گذر گئے ۔ پھر یوں ہوا کہ ایک دن میرے ایک شاعر دوست زاہد کمال کے بڑے بھائی مرزا صاحب نے جو آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد میں کسی شعبہ کے منتظم تھے، مجھ سے اپنے گھر کی مخصوص محفلِ شعر میں شرکت کرنے کی خواہش کی ۔ اُن کا گھر ڈاکٹر قمرالدین کے مکان کے روبرو تھا ۔ اُس محفل میں بھی انجم قمر سوز نے چلمن کے پیچھے سے کلام سُنایا تھا، ڈاکٹر قمرالدین نے لہک لہک کر پُرسوز ترنم میں غزل سنائی تھی

کچھ دن اور گذر گئے۔ سنگا ریڈی (ضلع میدک) میں ایک مشاعرہ تھا۔ سعد حسین سعد آئی۔ اے۔ ایس، وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اُن کے زمانے میں وہاں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر قمر الدین کی پوسٹنگ بھی سنگا ریڈی پر ہوئی تھی۔ مشاعرہ کے بعد ڈاکٹر قمر الدین نے اپنے گھر پر شاعروں کو چائے پر بلایا تھا۔ ڈاکٹر قمر الدین سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ سنگا ریڈی کے اُس مشاعرہ میں کلیم قریشی سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

اُن دنوں عزیز قریشی پروگرام اگزیکیٹو آل انڈیا ریڈیو، خاتون شعراء کا ایک مشاعرہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں نہ صرف رسالہ خاتونِ دکن، سے وابستہ ہوں بلکہ روزنامہ سیاست کے شعبۂ شعر و سخن سے بھی تعلق رکھتا ہوں، اس لئے انہیں یقین تھا کہ میں شاعرات کو آل انڈیا ریڈیو کے مشاعرہ میں مدعو کرنے کے سلسلہ میں اُن سے بھرپور تعاون کروں گا۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں شاعرات کو مدعو کرنے کے سلسلے میں اُن سے تعاون کروں۔ میں نے یہ ذمہ داری قبول کی۔ اُس مشاعرہ کے لئے تقریباً ۱۵ شاعرات کو مدعو کیا گیا تھا۔ میں نے نئی شاعرات میں انجم قمر سوز کا نام بھی تجویز کیا۔ اس سلسلے میں، ایک علحدہ خط ڈاکٹر قمر الدین کو لکھا۔ یہ شاندار یادگار مشاعرہ آل انڈیا ریڈیو کے احاطہ میں مدعو سامعین کی موجودگی میں ہوا تھا۔ مشاعرے کی اس محفل میں شہر کے ممتاز شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور باذوق خواتین و حضرات کی کثیر تعداد نے شرکت کی تھی۔ گرما کا موسم تھا، فضا میں خوشگوار ماحول کی بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی تھی۔ سارا ماحول معطر تھا۔ مشاعرہ سننے والے

اس قدر شائستہ تھے کہ محسوس ہو رہا تھا کہ سب کے سب ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں۔ آدابِ محفل، اندازِ گفتگو، ملاقات کے طور طریق، سارے ماحول میں شگفتگی کا احساس دلا رہے تھے۔ میں اپنے شاعر دوستوں کے ساتھ پہلی صف میں بیٹھا ہوا تھا۔ خواتین کی نشستوں کے لئے مشاعرہ گاہ کے دائیں جانب علیٰحدہ انتظام تھا۔ مشاعرہ کے آغاز سے قبل کسی نے مجھ سے کہا کہ شعبۂ خواتین سے کوئی محترمہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں اُن صاحب کے ہمراہ چلا گیا۔ جیسے ہی میں خواتین کے سکشن کے قریب پہونچا تو ایک اجنبی مگر جانی پہچانی آواز نے مجھے مخاطب کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں انجم قمر سوز ہوں۔ ویسے میں نے بھی دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ انجم قمر سوز ہی ہیں۔ میں نے انجم قمر سوز کو اس مشاعرہ میں پہلی دفعہ دیکھا۔ اس مختصر تعارف کے بعد میں اپنی صف میں چلا گیا، پھر میں نے نشست سنبھال لی۔ کچھ دیر بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ انجم قمر سوز نے پُر سوز ترنم میں ایک خوبصورت غزل سنائی۔ سامعین نے داد و تحسین سے نوازا۔ انجم قمر سوز کا یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں انہوں نے پردہ سے باہر آکر کلام سُنایا تھا۔ مشرقی تہذیب سے آراستہ اس شاعرہ نے اپنے پُرسوز کلام سے ساری محفل کو متاثر کیا تھا۔ اس مشاعرہ کے بعد سے انجم قمر سوز سے ملاقاتوں کا سلسلۂ جاری ہوا۔

محفلِ خواتین کی "پہلی غزلوں کی رات" کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ میں نے صدر محفلِ خواتین عظمت عبدالقیوم سے انجم قمر سوز کا تعارف کروایا۔ انجم قمر سوز محفلِ خواتین کی رکن بن گئیں۔ عظمت آپا نے میرے

مشورہ سے انہیں 'غزلوں کی رات' کا کنوینر نامزد کیا۔ غزلوں کی رات کے پروگرام کے سلسلے میں مجھے انجم قمر سوز سے بار بار ملنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ وہ اُن دنوں اپنی پھوپی کے ہاں آتما پورہ میں رہتی تھیں۔ (سنگار یڈی بھی جایا کرتی تھیں)۔ عظمت عبد القیوم کی مشاورت سے ہم غزلوں اور گلوکاروں کا انتخاب کیا کرتے تھے۔

پہلی غزلوں کی رات ۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو نمائش کلب میں منعقد ہوئی تھی جس میں شہر کی ممتاز شخصیتوں کے علاوہ اہل ذوق اصحاب نے شرکت کی تھی۔ اُس غزلوں کی رات کے بارے میں اُس وقت کے شرکائے محفل کا خیال ہے کہ اُس محفلِ موسیقی کا تاثر آج بھی برقرار ہے۔ ...ں کی رات بے حد کامیاب رہی۔ اس کامیاب محفلِ موسیقی کے بعد بھی انجم قمر سوز سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ کبھی مشاعروں کے سلسلہ میں تو کبھی مجموعۂ کلام کی اشاعت کے بارے میں۔ یہ ملاقاتیں جب زیادہ بڑھنے لگیں تو ہم دونوں تکلفات کے دائرہ سے باہر نکل کر بھائی بہن کے پاکیزہ رشتہ سے منسلک ہوگئے۔ یہ رشتہ اب بھی اسی تازگی، شگفتگی اور جذباتی ہم آہنگی کے ساتھ برقرار ہے۔

انجم آپا ایک ہمہ صفت شخصیت کی مالک ہیں۔ اُن کی مسکراہٹ سے زیادہ مجھے اُن کا قہقہہ پسند ہے۔ میں اکثر اُن سے خفا سا ہو جاتا تھا، پھر خود ہی اپنے طور پر اُن کے گھر جاتا۔ انجم آپا نے ہمیشہ خلوصِ دل سے میرا استقبال کیا۔ شعری مجموعہ سوزِ قمر، میرے مسلسل اصرار پہ شائع ہوا۔ کتاب کی اشاعت کا سارا کام میں نے خود اپنے ذمہ لیا تھا۔ جناب فصیح الدین ریٹائرڈ

سشن جج (والد محترم انجم قمر سوز) کی رہائش گاہ واقع سالار جنگ کالونی میں سابق گورنر مہاراشٹرا جناب صادق علی نے "سوزِ قمر" کی رسم اجرا انجام دی تھی جس میں مخصوص شاعروں اور ادیبوں نے شرکت کی تھی۔ انجم آپا کے مزاج میں پہلی ملاقات کے وقت جو شگفتگی تھی، آج بھی برقرار ہے۔ آج بھی سرسبز و شاداب پھولوں کی طرح اپنے اہل خاندان، رشتہ داروں اور دوستوں میں اپنے خلوص کی خوشبو بانٹتی رہتی ہیں۔ انجم قمر سوز کی شائستہ طبیعت، شرافتِ نفس، مزاج کی نرمی اور روابط کی پاسداری نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا۔ میں اُن کے رکھ رکھاؤ، انداز گفتگو اور لب و لہجہ کے تیکھے پن کے علاوہ اُن کی شعری، ادبی و تہذیبی صلاحیتوں اور سلجھے ہوئے اندازِ فکر کا قائل ہوں۔ انجم قمر سوز ایک خوشحال گھرانے کی چشم و چراغ ہیں، جن کا سارا گھرانہ شعر و نغمہ کے ماحول سے سرشار رہا کرتا ہے۔ اُن کی والدہ کو موسیقی سے بے حد لگاؤ ہے خاص طور پر کلاسیکی گائیکی اُن کی فطرت کا خاصہ ہے۔ اُن کے والد محترم مولوی فصیح الدین خالص حیدرآبادی رنگ کے ایک باوقار شخصیت کے مالک ہیں۔ انجم قمر سوز کے بھائی نسیم احمد اپنے دور کے ایک نمایاں طالب علم رہے ہیں۔ اُن کی بہنوں میں خاص طور پر رضیہ حسیب اعلیٰ ادبی ذوق رکھتی ہیں۔ حسنِ اتفاق سے انجم قمر سوز اور میں ایک ہی محلہ ملے پلی میں رہتے ہیں۔ اتنی قربت کے باوجود زیادہ تر فون پر ہی گفتگو رہتی ہے۔ فون پر گفتگو سے ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ فاصلے کس قدر گھٹ گئے ہیں۔

--



انیس قیوم فیاضؔ

"خاتونِ دکن" سے وابستگی کے بعد حیدرآباد کے بعض نئے لکھنے والوں کی تحریریں رفتہ رفتہ مجھے متاثر کرنے لگیں، جن میں طالبات بھی تھیں، طالب علم بھی اور بعض اُردو کے اساتذہ بھی۔ ان کے علاوہ معروف اہلِ قلم مرد و خواتین کی تخلیقات سے بھی میں متاثر ہوا۔ اس دوران مرد اہلِ قلم اصحاب کے ساتھ کچھ خاتون افسانہ نگاروں، ادیبوں اور شاعرات سے بھی ادبی خطوط کا سلسلہ جاری رہا۔ رشتوں کی پاکیزگی اور شائستہ روابط نے بھی احساس دلانا شروع کیا۔

'خاتونِ دکن' کے سلسلہ کا شائستہ اور پاکیزہ رشتوں کا ایک بہترین تحفہ انیس قیوم بھی ہے۔ مجھے اُن دنوں جتنی تحریروں سے سابقہ پڑا اُن میں سب سے زیادہ موثر صرف انیس قیوم کی تحریر ہوتی تھی۔ انیس کے خطوط موتیوں میں ڈھل کر نکلتے تھے۔ میری تمام بہنوں میں انیس پہلی بہن ہے جس نے مجھے سب سے زیادہ خطوط لکھے ہیں اور ہر خط میں کبھی نہ ختم ہونے والی بھائی بہن کی محبت کی خوشبو رہتی تھی۔ لیبیا میں سکونت کے زمانے میں بھی انیس مجھے پابندی سے خطوط لکھا کرتی تھی۔ انیس قیوم اُس وقت ایک افسانہ نگار کی حیثیت

سے مشہور ہوچکی تھیں۔ جب وہ بی۔ ایس سی کی طالبہ تھیں تو اُن دنوں زیادہ تر افسانے بانو اور بیسویں صدی میں شائع ہوتے تھے۔ جب خاتونِ دکن ، ادبی حلقوں میں مقبول ہونے لگا تو مجھے حیدرآباد کے بہت سے اہلِ قلم خواتین و حضرات کا تعاون حاصل ہونے لگا۔ " خاتونِ دکن " کے لئے شاعروں اور ادیبوں سے خط و کتابت میں ہی کیا کرتا تھا۔ انیس کو میں نے ہمیشہ بہترین مشورہ دیا۔

ایک دن راکھی پونم کے موقع پر مجھے پوسٹ کے ذریعہ ایک راکھی ملی۔ اس راکھی میں کچھ ایسی پاکیزگی اور کشش تھی کہ مجھے ایک دن انیس کے گھر جانا پڑا۔ انیس کے گھر والوں نے میرا خیر مقدم کیا۔ غالباً انیس نے پہلے ہی اپنے گھر والوں (والدین) سے میرا غائبانہ تعارف کرایا تھا۔ ادبی ہم آہنگی کے ساتھ ہماری فلسفۂ تحریر نے کچھ ایسا رنگ اختیار کیا کہ ہم بھائی بہن کے پاکیزہ رشتہ میں بندھ گئے۔ انیس نے بی۔ ایس سی اور بی۔ ایڈ کرنے کے بعد ایوننگ کالج (جامعہ عثمانیہ) سے ایم اے اُردو امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ تعلیمی اُمور میں وہ مجھ سے مشورہ کیا کرتی تھی۔ میں نے نیشنل ہائی اسکول (چھتہ بازار) میں ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت دلوائی۔ انیس نے اس اسکول میں تقریباً ۴ سال تک کام کیا۔ اس اثناء میں اس کی شادی ہوگئی۔ انیس کے شوہر فیاض اقبال اُس وقت ایرفورس میں انجینئر تھے۔ وہ ایک سنجیدہ، کم گو، سُلجھے ہوئے عمدہ انسان ہیں۔ ان دنوں وہ کلف ایر، ابوظہبی میں انجینئر ہیں۔ ان دونوں کی ازدواجی زندگی بے حد کامیاب ہے۔ شادی کے بعد انیس اور اقبال میرے گھر آئے اور میری اہلیہ اور بچوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

میں نے انیس کے افسانوں کا مجموعہ "گھر کی دیوار" اپنی نگرانی میں شائع کیا۔ دوسری کتاب "حیدرآباد میں اردو افسانہ نگاری" میں بھی میرا تعاون رہا۔ اس کتاب کی اشاعت کے لئے محکمۂ تعلیمات کے علاوہ ادبی ٹرسٹ اور نظامس اُردو ٹرسٹ نے رقمی امداد دی تھی۔ "حیدرآباد میں اُردو افسانہ نگاری" انیس قیوم کے ایم۔اے کا ڈسرٹیشن تھا۔ "خاتونِ دکن" میں انیس کے بہت سے افسانے شائع ہو چکے ہیں۔

انیس مجھے ہر سال پابندی سے راکھی باندھتی رہی۔ اپنے شوہر کے ساتھ سات برس تک لیبیا میں رہنے کے بعد گذشتہ تین سال سے حیدرآباد میں ہے۔ وہ جب بھی حیدرآباد آتی، مجھ سے ملنے کے لئے اپنے شوہر کے ہمراہ دفتر سیاست آجاتی، پھر دونوں میرے گھر آجاتے۔ یہ اُن کا ایک طریقہ تھا۔ انیس اِن دنوں شاداں اسکول میں درس دیا کرتی ہے۔ انیس کا لڑکا فراز، شاداں کالج آف انٹرمیڈیٹ میں زیر تعلیم ہے اور بیٹی فرزاں، میٹرک کا امتحان دے رہی ہے۔ ماں باپ کی طرح یہ دونوں بھائی بہن نہایت خوبصورت اور صحت مند ہیں۔ میرے گھر کے لوگ انیس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ انیس نے میرے بڑے لڑکے شمس الدین عارف کی شادی کے انتظامات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ انیس اس طرح میرے گھر آتی ہے جیسے ایک حقیقی بہن، اپنے پورے حقوق، اور اعزازات کے ساتھ اپنے بھائی کے ہاں آتی ہے۔ انیس ہے بھی اس قابل کہ اس کا خیال رکھا جائے۔

زندگی کچھ اس قدر مصروف ہو گئی ہے کہ اب انیس سے مہینوں ملاقات

نہیں ہوتی، لیکن فون پر خیر و عافیت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جب انیس اپنی شادی کے بعد پہلی دفعہ اپنے شوہر کے ساتھ میرے گھر آئی تو اُس نے اپنے کان کی خوبصورت سونے کی بالیاں میری چھوٹی لڑکی زینت نسرین کے کانوں میں پہنا دی۔ زینت نسرین اپنی پھوپی کے اس پُرخلوص تحفہ کو تمام تحفوں میں سب سے اہم تحفہ سمجھ کر خوشی محسوس کرتی ہے۔



مظفر النساء نازؔ

احاطۂ سکریٹریٹ میں محکمۂ قانون سے وابستہ ایک برقعہ پوش لڑکی پر جب پہلی دفعہ میری نظر پڑی تو میں ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ اس کے ہمراہ محکمۂ تعلیمات سے وابستہ ایک لڑکی شمسیہ بھی تھی۔ یہ دونوں جی۔اے۔ڈی اور محکمۂ تعلیمات کے موڑ پر محوِ گفتگو تھیں۔

اُن دنوں سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ آل انڈیا ریڈیو اور دیگر ادبی و شعری پروگراس کے سلسلے میں مجھے سکریٹریٹ میں کام کرنے والے باصلاحیت فنکاروں، شاعروں اور ادیبوں کی تلاش تھی۔ سکریٹریٹ میں بہت سی ادب دوست لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ یاد نہیں کہ مظفر النساء نازؔ سے میرا تعارف کہاں اور کس جگہ ہوا تھا، البتہ اتنا یاد ہے کہ محکمۂ قانون سے وابستہ ایک آندھرائی ڈرامہ آرٹسٹ عبدالغفور نے تعارف کرایا تھا۔ مظفر النساء نازؔ سے تعارف کے بعد میں نے ان سے سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں شامل ہونے کی خواہش کی۔ مظفر النساء نازؔ سکریٹریٹ کی دیگر لڑکیوں کے ساتھ شریک انجمن ہوگئیں۔ میں نے مظفر النساء نازؔ کو شعبۂ خواتین کا انچارج بنایا۔ سکریٹریٹ کی جن لڑکیوں نے اُردو اسوسی ایشن

سے وابستگی اختیار کی اور پروگرامس میں حصّہ لینا شروع کیا، اُن میں سے مظفر کے علاوہ شمسیہ، محسنہ، شیریں، قابل ذکر ہیں۔

مظفر النساء ناز کو شاعری کا بے حد شوق تھا، وہ اُن دنوں افسانے بھی لکھا کرتی تھی۔ مظفر النساء ناز ایک وقت میری شاگرد بھی بن گئی اور بہن بھی۔ میں نے سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے مشاعروں کے علاوہ شہر کے بعض اچھے اور ثقہ قسم کے مشاعروں میں کلام سنانے کی ترغیب دی۔ جب محفلِ خواتین کا قیام عمل میں آیا تو وہ محفلِ خواتین سے وابستہ ہوگئیں۔ مظفر النساء ناز کے شوہر فخرالدین نیاز بھی شعر کہتے ہیں لیکن وہ مشاعروں میں کلام نہیں سناتے۔ مظفر کے ادبی ذوق کی تربیت میں نیاز صاحب کا بھرپور تعاون شامل ہے۔ شعروادب کی وساطت سے ہمارے روابط بڑھنے لگے۔ مظفر بلا تکلف میرے گھر آیا کرتی۔ میرے اہل خاندان، مظفر کی فراخ دلی کے ساتھ پذیرائی کیا کرتے۔ جب تک مظفر النساء ناز سکریٹریٹ میں رہی، اسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی رہی۔ جب اس کا تقرر الکٹریسٹی بورڈ (ویدت سُودھا) میں ہوا تو اُس نے وہاں کی بزمِ اُردو کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینی شروع کی۔ بزمِ اُردو کے زیرِ اہتمام بہت سے اچھے اچھے مشاعروں کے انعقاد میں تعاون کیا۔

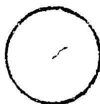
مظفر النساء ناز کا پہلا مجموعۂ کلام "بات پھولوں کی" میری نگرانی میں شائع ہو چکا ہے۔ رسمِ اجراء کی تقریب اعلیٰ پیمانے پر مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوئی تھی۔ مظفر النساء ناز کے شعری ذوق کو محسوس کرتے ہوئے میں نے صدرِ محفلِ خواتین عظمت عبدالقیوم سے خواہش کی تھی کہ مظفر النساء ناز

کو محفلِ خواتین کا رکن بنائیں۔ عظمت عبدالقیوم نے نہ صرف رکن ہی بنایا بلکہ شریک معتمد و خازن کی ذمہ داری بھی سونپ دی۔ مظفر ایک اچھی شاعرہ ہی نہیں ایک اچھی آرگنائزر بھی ہے۔ محفلِ خواتین کے لئے مظفر کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ مظفرالنساء نازؔ کی حیدرآباد کی شاعرات میں اپنے مزاج کی شائستگی، طبیعت کی پاکیزگی، سلیقہ شعاری اور وضع داری کی وجہ سے اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ مظفر نے شہر کے مشاعروں کے علاوہ اضلاع کے بعض خاص خاص مشاعرے بھی پڑھے ہیں۔ محفلِ خواتین کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ہم عظمت عبدالقیوم کی رہائش گاہ "خیابان" امیر پیٹ میں اکثر ملا کرتے تھے۔ عظمت عبدالقیوم، مظفر کو بہت چاہتی تھیں، محفلِ خواتین کی سرگرمیوں میں اُس پر بھروسہ کرتی تھیں۔ عظمت عبدالقیوم کے تفویض کردہ ہر کام کو وہ سلیقہ سے انجام دیا کرتی تھی۔ وہ آج بھی محفلِ خواتین کی شریک معتمد اور خازن ہے اور پُراعتماد فضاء میں کام کر رہی ہے۔ مظفرالنساء نازؔ مشرقی ماحول کی ایک ایسی مہذب خاتون ہے جس کی سادگی اور بھولاپن قابلِ رشک ہے۔ خاموشی، کم سخنی، بُردباری اور بزرگوں کا احترام اس کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ مظفر شستگی زیادہ ہے اور بولتی کم ہے وہ مجھ سے ہمیشہ نرم لہجے میں گفتگو کرتی ہے۔ ایک سعادت مند، محبت شناس اور سچے دل سے پیار کرنے والی بہنوں میں مظفرالنساء نازؔ کا بھی اہم مقام ہے۔ کبھی کبھی میں کسی بات پر ناراض ہو جاتی ہوں تو مظفر سہم جاتی ہے، خفا ہو جاتا ہوں تو رنجیدہ ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی لہر میں آجاتی ہے تو کُھل کر گفتگو کرتی ہے۔ کبھی میرے ساتھ

ممتاز شعرا رئیس اختر اور فیض الحسن خیال کو دیکھتی ہے تو کہتی ہے، یہ دونوں آپ کے "بازو بند" ہیں۔ ہم تینوں کی مثالی دوستی پر وہ خوش ہوتی ہے۔

اگر انسانی رشتوں کی بنیاد بے لوث خلوص، پاکیزہ جذبات اور شرافتِ نفس کی آئینہ دار ہو تو ایسے رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے بلکہ جیسے جیسے دن گذرتے جاتے ہیں، اُن رشتوں کی تازگی اور شگفتگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ مظفر، شبنم سے دُھلے ہوئے لمحوں کی پہچان ہے۔

--



شفیعہ قادری

میری تمام بہنوں کی محبت اپنی جگہ مسلمہ سہی لیکن شفیعہ قادری نے صالحہ الطاف کی طرح میری زندگی کے تمام روشن پہلوؤں کو سورج کی کرنوں سے جگمگایا ہے۔

میری شاعرانہ زندگی کو نقد و نظر سے روشناس کرانے کے علاوہ میرے فکر و خیال کو مہمیز کیا ہے۔ ایک ذہین و فطین مبصر کی طرح میری شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتے ہوئے مجھ کو اپنی پہچان کا احساس دلایا ہے اور میرے شعری سفر کی خوشگوار اور مشکل پسند راہوں کی نشان دہی کی ہے۔ اس کے باوجود شفیعہ کا یہ احساس ہے کہ میرا شعری سفر اُس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ میں احساسات اور جذبات کی مختلف پگڈنڈیوں سے گذرتے ہوئے تجربات کی منزل تک نہ پہونچوں۔

شفیعہ' دل و جان سے چاہنے والی بے لوث جذبات سے معمور میری بہن نہیں' میری ایک ملکوتی طاقت بھی ہے جو مجھے باحوصلہ جینے کا فن بھی سکھاتی ہے وہ ایک باخبر رہبر کی طرح میری شخصی' سماجی اور شاعرانہ زندگی کو ایک ایسی منزل پر دیکھنا چاہتی ہے' جہاں تک پہونچنے کی لوگ آرزو کرتے ہیں۔ وہ میری سچی اور پُر خلوص ہمدرد ہی نہیں بلکہ ایک ایسی شخصیت کی مالک بھی ہے جو دنیا کو ہمیشہ اپنی نظر سے دیکھنے کی تلقین کرتی ہے۔ وہ روشنی کی تلاش کے لئے سب سے

پہلے اپنے وجود کو مرکز بناتی ہے۔ شفیعہ کا خیال ہے کہ انسان کے لئے پہلے اپنی شناخت ضروری ہے تب کہیں اُس میں دوسروں کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا فلسفۂ حیات ' انسانی اعلیٰ روایات کی پاسداری کرتا ہے۔ اس کے دل میں زندگی کے ایک ایک لمحہ کو صدیوں میں بدلنے کی خواہش کروٹیں لیتی رہی ہے۔ اس کے خیال میں صرف روشنی ہی مقصدِ حیات نہیں ہے بلکہ وہ سمجھتی ہے کہ تاریک رہگذاروں سے بھی روشن چراغ نمودار ہوتے ہیں۔ شفیعہ ایک ایسی علامت ہے جس میں سچائی، صداقت اور حُسنِ مروت کے سارے سامان پیدا ہیں۔ ایک روشن حقیقت کی طرح زندگی کے تمام حُسن کو اپنی آنکھوں میں سمونا چاہتی ہے۔ یہ ساری باتیں اُس کی حرکیاتی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔

شفیعہ ایک دن مجھ سے ملنے کے لئے دفتر سیاست آئی۔ اُن دنوں وہ پروفیسر مغنی تبسم کی نگرانی میں " حیدرآباد کے علمی و ادبی اداروں " پر ایم فل کے لئے مقالہ لکھ رہی تھی۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اُسے میرے ہاں بھجوایا تھا۔ شفیعہ مجھ سے ملنے سے پہلے عابد علی خاں صاحب مدیر سیاست' کے پاس گئی تھی انہوں نے کہا کہ نیرؔ صاحب آفس میں ہیں، وہاں جاکر مل لیجئے۔ شفیعہ نے مجھ سے اپنا تعارف کروایا لیکن وہ تو میرے قبیلے کی لڑکی نکلی۔ بنجارے مختلف علاقوں میں بٹ بھی گئے تو کیا' ایک دن اپنے قبیلے میں آکر مل جاتے ہیں۔ شفیعہ میری قرابت دار نکلی۔ بیدر میں میرے خاندان کے بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے جدِ اعلیٰ بیدر کے ایک صوفی منش بزرگ حضرت سید قطب الدین حسینی بخاری کے ساتھ بیدر سے ہمنا باد آئے تھے۔

ایوانِ اُردو میں کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ بیدر کی دو انتہائی ذہین لڑکیاں حیدرآباد یونیورسٹی میں ایم فل کر رہی ہیں۔ ان دونوں نے جواہرلال نہرو یونیورسٹی دہلی سے امتیازی حیثیت سے ایم اے کیا تھا۔ شفیعہ نے دورانِ گفتگو اپنے بھائی پروفیسر کلیم اللہ قادری کا حوالہ دیا (جو کیلاسس یونیورسٹی میں ایک مشہور سائنٹسٹ ہیں) اور دوسرے بھائی صبغتہ اللہ کے بارے میں بھی بتایا۔ شفیعہ کے تعلیمی معاملات میں مَیں نے بہت زیادہ ساتھ دیا ہے۔ ایم فل کے بعد جب اُس نے پی ایچ ڈی کے لئے جامعہ عثمانیہ میں اپنا نام رجسٹر کروایا تو میں نے کتابوں کی فراہمی کے سلسلے میں بھی تعاون کیا۔ آل انڈیا ریڈیو سے ادبی پروگرامس دلوائے۔ اخبار سیاست میں مضامین چھپوائے۔ ویمنس کالج میں پارٹ ٹائم لکچرر شپ کے لئے کوشاں رہا۔ ایم فل کے مقالے کی اشاعت کے سلسلے میں نئے ادبی ٹرسٹ اور تعلاس اُردو ٹرسٹ سے گرانٹ دلوائی۔ حیدرآباد کے علمی و ادبی ادارے کے نام سے کتاب چھپوائی۔ اس کتاب کے بعد ریڈیائی پروگرامس میں نشر شدہ مضامین پر مشتمل کتاب "تعارف" شائع کیا۔ اس کے علاوہ ایک بڑے بھائی کی طرح اُس کی سرپرستی کرتا رہا۔ المدینہ کالج آف ایجوکیشن محبوب نگر میں بحیثیت لکچرر ملازمت دلوائی۔ جب شاداں کالج آف ایجوکیشن قائم ہوا تو عظمت آپا کے تعاون سے وہاں لکچرر کی حیثیت سے اُس کا تقرر ہوا۔ جوتیرو ڈگری کالج کی لکچرر بنی۔ شفیعہ نے شاداں کالج میں عظمتِ عیاباں کے نام سے ایک ادبی انجمن بنائی۔ وہ پابند صوم و صلوٰۃ، دیندار اور مذہبی علوم سے آراستہ لڑکی ہے ـــــ برجستہ تحریر اور ادبی و سیاسی موضوعات پر اظہارِ خیال کا ملکہ اُسے حاصل ہے۔ مشرقی تہذیب کی پروردہ ہونے کے باوجود

روشن خیالی اس کا وصف ہے۔

شفیعہ نے تین دفعہ بیرونِ ملک کا دورہ کیا ہے۔ پہلی دفعہ ۱۹۸۳ء میں ۳ ماہ کے لئے کنیڈا گئی تھی۔ دوسری مرتبہ ۱۹۸۸ء میں کیانسس (امریکہ) چلی گئی۔ تیسری مرتبہ جنوری ۱۹۹۱ء میں شکاگو گئی۔ جب کبھی وہ بیرونِ ملک سے انڈیا آتی ہے تو کچھ ہی دن بعد اپنے حیدرآبادی رنگ میں ڈھل جاتی ہے۔

شفیعہ بہت سی اعلیٰ صلاحیتوں کی مالک ہے۔ اس کو ادب عالیہ کا بہت شوق ہے۔ اچھی کتابیں جمع کرنا اور پڑھنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس کے خاندان کا سلسلہ بیدر کے ایک صوفی منش عالم دین ولی صفت بزرگ حضرت امام المدرسین سے ملتا ہے۔ بیدر میں محلہ مدرس پورہ ان ہی کے نام سے بسایا ہوا ہے۔

شفیعہ سے میرا رشتہ اس تعاتقاہی نظام کا ایک ایسا حصّہ ہے جس کو تشنگانِ عرفانِ محبت، قلندری کو اُجالوں کی سرزمین کا ورثہ سمجھتے ہیں۔ شفیعہ سے میرا رشتہ، خونی رشتوں، دودھ کے رشتوں اور انسانی رشتوں کی ایک ملی جلی کیفیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ میری عزیز ترین بہنوں میں مختلف خصوصیات کے سبب ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ وہ شدت سے مجھے محسوس کرتی ہے۔ میں بھی شدت کی اسی سطح پر پہنچ کر عبادت گاہوں کی پاکیزہ و معطر فضاؤں میں ضم ہوجاتا ہوں۔ شفیعہ کے نام "سفر جاری ہے" کا انتساب بھی ان ہی جذبات کا آئینہ دار ہے۔

شفیعہ جب پہلی بار امریکہ جارہی تھی تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ

شائد وہ لوٹے گی نہیں ، اُس موقع پر شفیعہ نے میرے چوتھے لڑکے نعیم الدین پرویز کو ایک قیمتی ایمپورٹیڈ امریکن کیمرہ اور میری آخری لڑکی زینت نسرین کو سونے کے جھمکے اور بالیاں دے کر بے حد خوشی محسوس کر رہی تھی۔ گھر کے تمام لوگوں سے اپنی والہانہ وابستگی کا اظہار اپنے مختلف عمل کے ذریعہ کیا کرتی تھی۔ مگر میرے لئے سب سے قیمتی شفیعہ کے آنسو تھے جس نے میرا دامن بھگو دیا تھا، اُن میں سے کچھ آنسو اب بھی پلکوں پر جھلملاتے ہیں، خاص طور پر اُس وقت جب اُسکی آنکھیں اشکوں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔



کویتا کرن

کویتا کرن سے میری پہلی ملاقات شعر و نغمہ کے ماحول میں ہمت۔ گلوکار وٹھل راؤ کے میوزیکل اسکول "سنگیت سادھنا" میں ہوئی۔ ایک شام جب میں سیاست آفس میں اپنے ادبی کام میں مصروف تھا تو میرے دوست وٹھل راؤ مجھ سے ملنے کے لئے آئے اور مجھ سے خواہش کی کہ کچھ دیر کے لئے ان کے ہمراہ سنگیت سادھنا اسکول چلوں جہاں مجھے اُن کے ایک دوست امباجی راؤ ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ پولیس کی ہونہار لڑکی سے نہ صرف تعارف کرانا ہے بلکہ اُس کو اپنے حلقہ تلامذہ میں شامل کرنا ہے۔

جب میں وٹھل راؤ کے ساتھ "سنگیت سادھنا" پہونچا تو وہاں موجود لڑکیوں میں مجھے حیدرآبادی تہذیب سے آراستہ ایک لڑکی سب سے الگ دکھائی دی۔ مجھے دیکھ کر اُس نے اندازہ لگایا کہ میں کون ہوں۔ وٹھل راؤ کے تعارف کرانے سے پہلے ہی اس نے مجھے حیدرآبادی انداز میں سلام کیا۔ اِس تعارف کے بعد میں نے کویتا کرن سے کچھ غزلیں سنیں اور یہ محسوس کیا کہ اگر مناسب انداز میں اس نئی شاعرہ کی شعری تربیت کی جائے تو ایک دن یہ ہونہار شاعرہ اُردو شعر و ادب میں اپنا مقام بنا سکے گی۔ کویتا کرن اُس وقت اُردو رسم الخط سے کچھ زیادہ واقف نہیں

تھی، اس لئے وہ (دیوناگری) ہندی رسم الخط میں اُردو غزلیں لکھتی تھی۔ میں نے کویتا سے پوچھا کہ تم اُردو زبان سے اچھی طرح واقف ہو تو پھر اُردو رسم الخط میں غزلیں کیوں نہیں لکھتیں۔ کویتا نے جواب دیا "مجھے اُردو رسم الخط میں لکھنے میں تکلف محسوس ہوتا ہے۔ (اب کویتا اُردو رسم الخط میں لکھی ہوئی کتابیں روانی کے ساتھ پڑھنے لگی ہے۔) کویتا نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ غزلیں سُننے کے علاوہ آڈیو اور ویڈیو کیسٹ سے غزلیں سُن سُن کر مجھے اُردو شاعری سے دلچسپی ہونے لگی اور میں نے اپنے منتشر خیالات کو شاعری کے روپ میں ڈھالنا شروع کیا۔

کویتا کرن ابتداء میں اپنے چھوٹے بھائی شیام کے ذریعہ بغرض اصلاح میرے ہاں غزلیں سیاست آفس بھجواتی رہی۔ حُسنِ اتفاق سے اُن دنوں شہر میں کئی اچھے مشاعرے ہوئے۔ میں نے کویتا کو "محفلِ خواتین" کے بارے میں بتایا اور شریکِ معتمد محفلِ خواتین مظفر النساء ناز سے کہا کہ اس نئی شاعرہ کی محفلِ خواتین میں خاطر خواہ پذیرائی ہونی چاہیئے۔ وہ محفلِ خواتین کے جلسوں میں شریک ہونے لگی۔ کچھ دنوں بعد جب کویتا نے کچھ اور غزلیں کہہ لیں تو مشورۂ سخن کے لئے مجھے اپنے گھر واقع ملے پلی آنے کی خواہش کی۔

جب میں پہلی دفعہ کویتا کے گھر پہونچا تو وہ مقررہ وقت پر میرا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے ہی میں نے اسکوٹر اسٹانڈ کی، وہ دروازہ کے قریب آکر ٹھہر گئی۔ دستک دی تو اس نے فوری کہا "آیئے بھائی"۔ میں نے جب اس کا ڈرائنگ روم دیکھا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی، اُس کا ڈرائنگ روم صاف

ستھرا، ہر چیز اپنی جگہ سلیقہ سے رکھی ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں نہ تو ہندو کلچر کی چھاپ تھی، نہ مسلم تہذیب کا رنگ۔ کویتا کا لباس پوشاک، اس کی گفتگو اس کے رہن سہن، اس کی نشست و برخاست، حیدرآبادیوں جیسی ہے۔ ملنے جلنے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ خالص حیدرآبادی تہذیب کی دین ہے۔

دوران گفتگو جب کویتا مجھے بھائی کہہ کر مخاطب کرتی، تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میں نے کویتا سے کہا تم پہلے میری بہن ہو، بعد میں میری شاگرد۔ ایسا کہنے پر وہ بہت خوش ہوئی۔ ایک دن وہ اپنے شوہر، بچوں اور اپنی بہن مینا کے ساتھ میرے گھر بازار روپ لعل (سید علی چبوترہ) آئی۔ دوپہر سے شام تک رہی۔ ہم نے لنچ مل کر کیا۔ میری اہلیہ اور میری لڑکی زینت نسرین نے ان مہمانوں کی تواضع کی۔ جب میں اپنے نئے گھر ملے پلی میں منتقل ہوا تو وہ اپنے بھائی کے ہمراہ میرے گھر آتی رہی۔ جب کبھی کوئی تازہ کلام ہوتا، میرے ہاں آتی یا اپنی والدہ کے مکان (واقع ملے پلی) مجھے بلواتی۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ گھر آنے سے پہلے فون ضرور کرتی تاکہ میں گھر پر موجود رہوں۔

کویتا ایک خوش گو، خوش فکر شاعرہ ہے۔ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ فی البدیہہ شعر کہہ سکتی ہے۔ شہر کے حالیہ فساد پر اُس نے بہت ہی متاثر کن نظم بھی تھی جو سیاست میں شائع ہوئی۔ اس نظم کی اشاعت کے بعد اس کی مقبولیت میں اور اضافہ ہو گیا۔ کویتا ایک کم آمیز شاعرہ ہے۔ وہ مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتی ہے۔ اُس کی شاعری کے ابتدائی زمانے میں صفدریہ گرلز ہائی اسکول میں اسکول کی سلور جوبلی تقاریب کا مشاعرہ ہوا تھا۔ یہ مشاعرہ کویتا

کی شاعرانہ زندگی کا یہ پہلا مشاعرہ تھا۔ اس مشاعرہ میں کویتا کو خوب داد و تحسین سے نوازا گیا۔ اس مشاعرہ کے بعد اُس کی شاعرانہ زندگی نے ارتقاء کی ایک نئی کروٹ لی۔ بعد ازاں اُس نے کئی مشاعرے پڑھے جن میں اس کو کافی سراہا گیا۔

کویتا کرن کی یہ خواہش تھی کہ اس کا مجموعۂ کلام جلد از جلد شائع ہو جائے۔ اُس کی خواہش کے پیشِ نظر میں نے اُس کے کلام کا انتخاب شروع کیا۔ کویتا کے والد امباجی راؤ صاحب نے اپنی بیٹی کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وہ کویتا کی ہر خوشی کا خیال رکھتے ہیں۔ امباجی راؤ ایک خالص حیدرآبادی مزاج کے انسان ہیں۔ وہ نہ صرف اُردو زبان سے ہی دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ وہ اچھی طرح اُردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو شہر کے خاص خاص مشاعروں میں خود لے آتے ہیں، کویتا کو مشاعروں میں داد ملتی ہے تو خوش ہوتے ہیں۔ کویتا نے شنکر جی میموریل کل ہند مشاعرہ کے علاوہ کئی بار ریڈیو سے اپنا کلام سنایا ہے۔ دوردرشن کے پروگرام ''انجمن'' کے علاوہ نیشنل پروگرام (نٹ ورک مشاعرہ) میں بھی کلام سنا چکی ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ تحت میں شعر سناتی ہیں، پڑھنے کا انداز متاثر کن ہوتا ہے۔

امباجی راؤ ایک دن اپنی بیٹی کے ہمراہ میرے گھر آئے اور مجھ سے خواہش کی کہ کویتا کا مجموعۂ کلام جلد از جلد شائع ہونا چاہیئے۔ کویتا نے اس دو سال کے عرصہ میں زائد ایک سو غزلیں کہہ لی تھیں۔ کچھ ہی دن بعد کویتا کا پہلا مجموعۂ کلام جو صرف غزلوں پر مشتمل ہے "پہچان" کے نام سے شائع ہوا۔ کتاب کی اشاعت کے بعد ادبی حلقوں میں کافی ہل چل رہی۔ مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ

انسٹی ٹیوٹ میں عظیم الشان پیمانے پر رسم اجراء کی تقریب منعقد ہوئی۔ جناب عابد علی خاں مدیر سیاست نے رسم اجراء انجام دی۔ جناب سید ہاشم علی اختر سابق وائس چانسلر عثمانیہ و علی گڈھ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے، ڈاکٹر موہن لال نگم ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم اور پروفیسر مغنی تبسم صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ میں اس تقریب کا کنوینر تھا۔ محفل کے اختتام پر ہاشم علی اختر صاحب اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے خاص طور پر کویتا اور اس کے اہل خاندان کو مبارکباد دی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ کویتا کو اپنے خواب کی تعبیر مل گئی (اس کا مجموعہ چھپ گیا)۔ اسے تو یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اردو حلقوں میں اس کی شاعری کی اس قدر پذیرائی ہوگی اور اردو شاعری کی بدولت ہی اس کی پہچان ہوگی۔

کویتا کرن مجھے ہر راکھی پونم کے موقع پر راکھی باندھتی ہے اور یا نوا [illegible] اس بات کی خواہاں رہتی ہے کہ بھائی بہن کا یہ پاکیزہ رشتہ ہمیشہ اسی تازگی کے ساتھ برقرار رہے۔

--



کتاب کا آخری صفحہ

ہمیں اپنے معاشرہ میں کچھ ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو زندگی کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن جاتے ہیں۔ طویل فاصلوں پر رہتے ہوئے بھی اپنی قربت کا احساس دلاتے ہیں۔ جن کی سانسوں کی گرمی اور جن کے فکر و خیال کی خوشبو پیراہنِ جسم و جاں کو ہمیشہ مہکاتی رہتی ہے اور جن کی لمحاتی گفتگو بھی صدیوں کا سفر طے کرتی ہے۔ ایسے لوگ ہمارے آس پاس ہی رہتے ہیں جو اپنا دکھ درد آپس میں بانٹ لینے کی تمنا کرتے ہیں۔ وہ اپنی پہچان کے لئے احساس کے دروازے پر دستک دیتے رہتے ہیں۔

اگرچہ رشتے ایک دوسرے کی پہچان اور سماج کے نظام کے لئے بنائے گئے ہیں لیکن کسی بھی رشتے کے درمیان اگر محبت نہ ہو تو رشتوں کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا۔ محبت رشتوں کو نہ صرف باقی رکھتی ہے بلکہ رشتوں کی تخلیق بھی کرتی ہے۔ ہر انسان کا دوسرے انسان سے رشتہ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی کم فہمی کی بناء پر اس رشتے کو پہچان نہیں پاتے۔ دراصل محبت مرکز ہے اور رشتہ دائرہ۔

یہ منتشر لوگ بے تاج بادشاہوں کی طرح پاکیزہ جذبات کا احترام کرتے ہوئے رشتوں کے تقدس کا تحفظ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی داستانِ مہر و وفا ختم ہی نہیں ہوتی کہیں نہ کہیں ان کے لئے آس کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ نقاب اوڑھے ہوئی شب کا آنچل ڈھلک ہی جاتا ہے۔ سناٹے آوازوں میں بدل جاتے ہیں۔ رشتوں کا ہجوم اٹھتا ہے سوچتا ہوں کہ رشتوں کے اس ہجوم میں کس کو کس نام سے پکارا جائے کیونکہ جذبۂ محبت تمام رشتوں سے اعلیٰ و ارفع ہے۔

